آئنے کے اس طرف

عالمتاب تشنہ کے پہلے مجموعۂ کلام کا "پیش لفظ" لکھتے ہوئے میں نے غالب کا یہ مصرع "دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک" دُہرایا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس مصرع کو لکھنے کا سبب یہ تھا کہ عالمتاب تشنہ کی ذات و صفات میں مجھے ایک اچھے اور بڑے شاعر بننے کے امکانات نظر آئے تھے۔ اُس وقت حضرت تشنہ یہ سمجھ رہے تھے۔ اور ہر جوان شاعر کو یہی سمجھنا چاہیئے جس کا پہلا مجموعۂ کلام شائع ہو رہا ہے۔ کہ وہ قطرے سے گہر بن چکے ہیں۔ گوہر بن جانا سفرِ تخلیق کی منزلِ آخر ہے اور تشنہ صاحب کا سفر نئے عزائم، نئے حوصلوں اور نئے ولولوں کے ساتھ ابھی جاری و ساری ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں وہ ٹھہراؤ، زبان کا وہ بہاؤ، لہجے کا وہ بانکپن، بیان کی وہ پختگی، احساس کی وہ لطافت، شعور کی وہ گہرائی اور روحِ عصر کی وہ گیرائی ہے جو معاصر شعراء میں خال خال نظر آتی ہے۔ ہمارے اس دور میں، جب اکثر شاعر اپنے آپ کو دُہرا رہے ہیں، تشنہ اُن معدودے چند شاعروں میں سے ایک ہیں جہاں نئی غزل کی روایت پل کر جوان ہو رہی ہے اور اسی لیے مجھے اُن کی شاعری سے گہری دلچسپی ہے۔ "آئینے کے اُس طرف" ایک ایسا مجموعۂ کلام ہے جسے اہلِ ادب اور صاحبانِ ذوق کو یقیناً توجہ سے پڑھنا چاہیئے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

ہم شہرۂ آفاق مصوّر جناب جمیل نقش صاحب کے ممنون ہیں جنہوں نے اس گرد پوش کی آرائش کی۔

آئینے کے اُس طرف

عالمتاب تشنہ

تاریخ	ستمبر ۱۹۸۵ء
تعداد	ایک ہزار ایک سو
مطبع	مشہور آفسٹ پریس ۔ کراچی
ناشر	ایوانِ ادب
	سی ۵۳۔ بلاک ۹ گلشن اقبال۔ کراچی
قیمت	۴۰ روپے
کاتب	خالد صدیقی ۔ خالد فاروق
اہتمام و ترتیب	محسن بھوپالی

آئینے کے اُس طرف

غزلیں

دُعا

خدایا مَیں جب بھی دُعا مانگتا ہوں
تو یہ چاہتا ہوں
کہ میرے دُعاؤں کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو
مہرِ و مہتاب چومیں
ستارے فلک سے اُتر کر ہتھیلی پہ میری
چراغِ قبولِ دُعا جگمگا دیں
بہاریں مجھے خوشبوؤں کی جزا دیں
فرشتے عدم سے قطاروں میں آئیں
تری رحمتوں اور تری نعمتوں کے
شگفتہ گلوں سے
مرا کاسۂ دست بھر دیں
" انعمتَ علیہِم " کی سب منزلوں کی خبر دیں

خُدایا میں جب بھی دُعا مانگتا ہوں

تو یہ چاہتا ہوں

مرے ہاتھ کنگورۂ عرش چھُو کر

مجھے سرتاپا نُور ہی نُور کر دیں

مَیں کیا چاہتا ہوں

تجھے سب خبر ہے

تو سب جانتا ہے

کہ تیری عطا کا بڑا سلسلہ ہے

ڈاکٹر وزیر آغا

پیش لفظ

کون نہیں جانتا کہ مغرب کا فلسفہ جب Cogito ergo sum پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آیا تو مغرب میں "مَیں اور تُو" I & Thou کا رشتہ باقی نہ رہا جیسا کہ قدیم زمانے میں تھا بلکہ "مَیں اور یہ" I and It کا رشتہ اُبھر آیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ناظر اور منظور اب زندہ اشیا کی طرح ایک دوسرے کے رُوبرُو نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان وہ رشتہ وجود میں آگیا ہے جو زندہ ہستی کا کسی بے جان شے کے ساتھ ہوتا ہے اور جو سائنسی فکر کے لیے اساسی حیثیت رکھتا ہے۔

"مَیں اور تُو" کے رشتے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھنے والے کے سامنے جو کچھ ہے، چاہے وہ کوئی پتھر ہے۔ درخت یا جانور ہے یا گہرا بادل یا کھلا آسمان ہے، اپنا ایک "زندہ وجود" رکھتا ہے اور اس کے ساتھ جذباتی سطح پر منسلک ہے۔ دوسری طرف "مَیں اور یہ" سے مراد یہ ہے کہ ناظر کے سامنے جو کچھ ہے وہ اُس سے قطعاً الگ، بے تعلق اور بے جان ہے۔ دراصل "مَیں اور یہ" کا رشتہ بنیادی طور پر سائنسی ہے جب کہ "مَیں اور تُو" کا رشتہ بنیادی طور پر شاعرانہ، اسطوری اور مذہبی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک "مَیں اور یہ" کے رشتے کا چلن اتنا عام ہوگیا تھا کہ بعض اوقات شاعری میں بھی یہ رشتہ اُبھر آیا۔ بالخصوص نظریہ بردوش شعرا نے تو زیادہ تر حقیقت پسندانہ سائنسی رویّے ہی کو اختیار کیا جس سے مسائل تو اُبھر کر نمایاں ہوئے لیکن شعریت اُسی نسبت سے منہا ہوگئی (حد یہ کہ بعض ادبی مکاتب نے فن کو زندگی کا آئینہ تک قرار دے ڈالا جو زندگی کو معروضی انداز میں It کہنے کے مترادف تھا) حالانکہ شاعر بنیادی

طور پر "مَیں اور تُو" کے رشتے کا موئد ہے۔ وہ باہر کی اشیا کو قطعاً غیر شعوری طور پر زندہ، دھڑکتی اور ہمکتی ہوئی دیکھتا ہے جیسے (مثلاً) چاند کو چہرہ، پہاڑی کو کوہان اور نرگس کو آنکھ کے روپ میں دیکھنا وغیرہ بلکہ Pars Pro Toto کے تحت جزو کو بھی بطور کُل مان لیتا ہے جیسے (مثلاً) نشانی کے رومال کو محبوبہ کی پوری شخصیت کا بدل قرار دینا وغیرہ۔ ان تمام صورتوں میں شاعر کے سامنے زندگی بلکہ بعض اوقات پوری کائنات Thou بن کر نمودار ہوتی ہے اور دونوں میں روحانی اور جذباتی انسلاک وجود میں آجاتا ہے۔ دوسری طرف شاعری میں It کا نمودار ہونا شاعری کی تکذیب پر منتج ہوتا ہے۔

میں اِس ساری "بوجھل گفتگو" کے لیے معذرت خواہ ہوں مگر مجھے عالمتاب تشنؔہ کی غزل میں "مَیں اور تُو" کا رشتہ اپنے متعدد العباد کے ساتھ اُبھرا ہوا نظر آیا ہے اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ اس رشتے کی فکری اہمیت کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں عرض کر دوں تاکہ عالمتاب تشنؔہ کی غزل کے اس امتیازی وصف کی بہتر طور پر پرکھ ہو سکے۔

یہ نہیں کہ اُردو غزل میں "مَیں اور تُو" کا یہ رشتہ پہلی بار عالمتاب تشنؔہ ہی کے ہاں نمودار ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ساری اُردو غزل میں اس کے شواہد جابجا ملتے ہیں۔ البتہ اس رشتے کے کرداروں میں تبدیلی ضرور آتی رہی ہے جس کے نتیجے میں اِن کرداروں کا ربطِ باہم ایک نئی روشنی میں سامنے آیا ہے مثلاً اُردو کی کلاسیکی غزل میں "مَیں" بطور ایک جزو اور "تُو" بطور ایک کُل واضح طور پر موجود ہے۔ کلاسیکی غزل میں "مَیں" کا رویّہ "رانجھا رانجھا آکھدی مَیں آپے رانجھا ہوای" ایسا ہے یعنی عاشق خود کو محبوب کی ذات میں پوری طرح ضم کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ رہا محبوب (یعنی تُو) تو کہیں وہ ایک حسین وجمیل بدن ہے، کہیں کوئی محترم اور مقدس ہستی اور کہیں کوئی ماورائی ہستی یا قوت! ۔ دونوں ایک دوسرے کے رُوبرو ضرور ہیں مگر اس طور کہ جزو (مَیں)۔ کُل (تُو) کو شیئت کا حامل نہیں سمجھتا بلکہ ایک متوازی زندہ ہستی کے طور پر محسوس کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ "تُو" سے ہمکنار ہو کر ابدیت کا حامل بن جائے۔

مگر نئی اُردو غزل میں "مَیں" اور "تُو" دونوں کے سلسلے میں تبدیلی کا احساس ہوتا ہے گو نوعیت کے اعتبار سے ان دونوں کا ایک دوسرے کے رُوبرو آنا Thou & I کے رشتے ہی کا حامل ہے نہ کہ It & I کے رشتے کا۔ جہاں تک "میں" کا تعلق ہے تو وہ اب منفعل یا تابع مہمل نہیں ہے یعنی اب اُس کی حیثیت محض ایک جزو کی سی نہیں بلکہ وہ اپنی انفرادیت، اپنے الگ وجود کا اعلان کر کے اُس "منفرد اکائی" میں بدل رہی ہے جسے آرتھر کوئسلر نے Holon کا نام دیا تھا۔ لہٰذا اب "مَیں" کا "تُو" میں ضم ہونے کا رویہ پسِ پشت جا پڑا ہے اور ہمہ وقت رُوبرو ہونے کی صورت زیادہ نمایاں ہوئی ہے دوسری تبدیلی یہ آئی ہے کہ خود "مَیں" کے اندر سے ایک اور "مَیں" نمودار ہوئی ہے، جو خودشناسی کی زائیدہ ہے اور جو ناظر اور منظور دونوں کو دیکھنے پر قادر ہے۔ ویدانت اور تصوّف نے اپنے اپنے وقت میں اِس "تیسری ہستی" کو بڑی اہمیت دی تھی جب کہ مغرب میں غالباً نِطشے وہ پہلا مفکّر تھا جس نے تیسری ہستی کے وجود کا احساس دلایا۔ مگر شاعری میں اس کی نمود نئے زمانے ہی میں ممکن ہوئی ہے۔ بالخصوص نئی اُردو غزل نے اس سلسلے میں ایک اجتہادی کارنامہ سرانجام دیا ہے اور اس نئی ہستی کو کبھی پرچھائیں، کبھی وہ (The other) اور کبھی "مَیں" میں موجود "مَیں" کے روپ میں پیش کیا ہے۔ عالمتاب تشنہ کی غزل میں بھی یہ ہستی اپنے جملہ ابعاد کے ساتھ نمودار ہوئی ہے۔

ویسے بھی عالمتاب تشنہ کی غزل ایک شعری Holon ہی کی صورت میں سامنے آئی ہے۔ ہر Holon اصلاً Janus-Faced ہے۔ جینس ایک دیوتا تھا جس کے دو چہرے تھے مگر ان میں سے ہر چہرہ مخالف سمت میں تھا۔ جنوری کے مہینہ کا نام جینس کے نام پر رکھا گیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ جنوری بھی Janus - Faced ہے۔ اس کا ایک چہرہ ہمہ وقت گزرے ہوئے سال کو دیکھتا ہے اور دوسرا آنے والے سال کو! عالمتاب تشنہ کی غزل میں روایت اور تجربہ کی بیک وقت کارفرمائی اُس کے اس خاص وصف ہی کو اُجاگر کرتی ہے۔ چنانچہ جہاں اُن کی غزلوں میں اس وضع کے اشعار کی فراوانی ہے کہ ؏

ماسوائے کارِ آہ و اشک کیا ہے عشق میں — بے سوادِ آب و آتش دیدہ و دل کے قریب

اے ساکنانِ شہر کوئی تازہ واردات — شیشہ گروں میں ذکر بہت آئینے کا تھا

پہلے دل اختیار میں رکھنا — پھر قدم کوئے یار میں رکھنا

اے کاش ہمیں آتے یہ خاص ہنر اُن کا — خود عہدِ وفا باندھیں اور صاف مکر جائیں

مرضِ عشق کا ممکن نہیں اب کوئی علاج — اک مسیحا سے یہ آزار ملا ہے مجھ کو

اُترا تھا مثلِ ماہ وہ اک روز آب میں — اُس دن سے موج موج ہے صد اضطراب میں

جو مواد اور اسلوب دونوں اعتبار سے اُردو غزل کے کلاسیکی رنگ کے غماز ہیں (گویا ماضی اور اس کی شعری روایات کی جانب نگراں ہیں) وہاں اُن کی غزل کا دوسرا چہرہ مستقبل کی طرف ہے اور نئے زمانے کے تازہ لہجے اور فکری زاویے کو خود میں سمونے کی کوشش میں ہے۔ مثلاً یہ چند اشعار!

تمہارا قرب بھی دُوری کا استعارہ ہے — کہ جیسے چاند کا تالاب میں اُتر جانا

یہ اک اشارہ ہے آفاتِ ناگہانی کا — کسی جگہ سے پرندوں کا کوچ کر جانا

ڈالے گئے شگاف دریچوں کے نام پر — دیوار کا تھا زخم جسے در کہا گیا

دیا اندھیرے کو بانٹ رہا تھا — میں بھی جھولی بھر لایا ہوں

ہرا بھرا ہے لان کا سبزہ — اندر سے میں سوکھ رہا ہوں

شکستِ شیشۂ دل کی صدا ہوں — میں خود بھی خود کو سُننا چاہتا ہوں

چھو لیا تم نے تو پہچان لیے جاؤ گے — دیکھنا روغنِ دیوار ابھی تازہ ہے

رات کے سارے منظر میرے اپنے تھے — جب آنگن میں چاند اُترا تو میں نے دیکھا

کتابوں میں لکھا تو عمر بھر تم نے پڑھا تشنہؔ — ذرا وہ بھی تو پڑھ لیتے جو دیواروں پہ لکھا ہے

گویا عالمتاب تشنہؔ کے لیے ماضی اور مستقبل (روایت اور تجربہ) یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ دونوں کی طرف اُن کا رویّہ بنیادی طور پر "میں اور تو" نوعیت کا ہے۔ وہ

ماضی، اس کی روایات اور اقرار کو بھی ایک زندہ ہستی کے طور پر محسوس کرتے ہیں اور مستقبل کی کلبلاتی ہوئی، امکانات سے لبریز دنیا کو بھی Thou کے روپ میں ہی دیکھتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ عالمتاب تشنہؔ نے زمانی بُعد میں بھی "مَیں اور تُو" کے رشتے ہی کو اُجالا ہے۔

مگر اس کے علاوہ بھی ان کی غزل میں "مَیں اور تُو" کے رشتے نے تخاطب اور ہم کلامی کے جملہ مراحل طے کیے ہیں مثلاً یہ چند شعر:

کون خوابوں میں مرے ساتھ سفر کرتا ہے
دشتِ تنہائی میں رہتا ہے مرے ساتھ یہ کون

کون مجھ کو ترے آنے کی خبر کرتا ہے
کون دے جاتا ہے دروازۂ دل پر دستک

یہ راستہ تو مجھے تیرے گھر کا لگتا نہیں
ہر ایک گام پہ یہ کون روکتا ہے قدم

بہت دنوں سے وہ چہرہ نظر نہیں آیا
جو آئینے سے مجھے مسکرا کے دیکھتا تھا

یہ سحرِ دید تھا کہ فسوں آئینے کا تھا
آنکھیں مری تھیں اور ترا عکس رُوبرو

کچھ ایسا کھل کے ملا، جگمگا گیا مجھ کو
لہو میں جیسے وہ جگنو پکڑ کے چھوڑ گیا

کربِ شامِ غم اپنا حالِ زارِ جاں اپنا
اُن کے رُوبرو کرتے درد تم بیاں اپنا

عالمتاب تشنہؔ کی غزل میں "تُو" گوشت پوست کی محبوبہ کی صورت میں بھی موجود ہے اور ایک ماورائی قوت کے روپ میں بھی اور یہ عمل ان کے ہاں کلاسیکی روایت سے مضبوط انسلاک کا اعلامیہ ہے مگر ان کی غزل میں "تُو" ان کی اپنی ذات کے اس حصے کے روپ میں بھی اُبھرا ہے جو "تیسری ہستی" بن کر خود ذات سے ہم کلام ہونے کی کوشش میں ہے۔ یہ روش اصلاً جدید دَور کی روش ہے جو فرد کے آشوبِ آگہی کی پیداوار ہے۔ آپ چاہیں تو اسے سیاحتِ باطن کا نام بھی دے سکتے ہیں مگر اصل بات شاید یہ ہے کہ پہلے "مکالمہ" مَیں اور تُو کے مابین تھا جبکہ نئے زمانے میں مکالمہ "مَیں اور مَیں" میں ہونے لگا ہے۔ تاہم لطف کی بات یہ ہے کہ اس گفتگو میں دوسری "مَیں" اپنی قلبِ ماہیت کے بعد "تُو" کے روپ میں اُبھر آئی ہے اور یوں "مَیں اور تُو"

کا رشتہ برقرار رہا ہے۔ عالمتاب تشنؔہ کی غزل میں "دوسری ہستی" کا یوں نمودار ہونا اس بات پر دال ہے کہ شاعر نے خود کو نئے زمانے کے فکری اور احساسی موسم سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔ قاری عالمتاب تشنؔہ کی غزل کی بے پناہ تازگی اور ان کے شعری اسلوب کی سندرتا سے تو بہرحال لطف اندوز ہوگا لیکن اگر وہ ان کی غزل کو اس تیسری ہستی کے زاویے سے دیکھنے کی بھی سعادت حاصل کرے جو ذات کے دو نیم ہونے سے پیدا ہوتی ہے اور بیک وقت ماضی اور مستقبل سے ہم رشتہ ہے تو مجھے یقین ہے کہ اُسے جمالیاتی حظ کی تحصیل کے مزید لمحات ضرور ارزانی ہوں گے اور وہ برملا کہہ اُٹھے گا کہ "تشنؔہ کی غزل نے مجھے پوری طرح سیراب کر دیا ہے۔"

ڈاکٹر وزیر آغا

۲۵ اگست ۱۹۸۵ء

گفتنی

عالمتاب تشنہ

ہم ایک ایسے دور میں زندہ ہیں جہاں انسان اپنے اُس مادی اور روحانی ربط کی تلاش میں ہے جو عہدِ نو کی افراط و تفریط میں کہیں کھو گیا ہے۔ مادی ترقی کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ آج کے دن رونما ہونے والا واقعہ کل ایک تاریخ بن جاتا ہے۔ ترقی کی اس تیز رفتار نمو پذیری نے نہ صرف انسان کو مادیت کا تابع و فرماں بنا دیا ہے بلکہ اس کی روح کی بالیدگی کو بھی مجروح کر دیا ہے۔ اسی مادیت نے معاشیات کو محور بنا کر ایک ایسی دُنیا کی داغ بیل ڈالی ہے جس نے شکم پُری کے تمام لوازم تو فراہم کر دیئے ہیں لیکن روح کی آسودگی کے لیے اس کے پاس سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس عہدِ رفتار میں جہاں نگاہ حیران و ششدر، جسم شل اور دماغ اندیشوں اور سانحوں سے نیم جاں ہو چکے ہیں جہاں آہنی مشینوں کے بھاری بھرکم پہیوں نے زمین کے قدرتی حسن کو کچل کر رکھ دیا ہے جہاں ایٹمی ہتھیار اس پُر بہار دُنیا کو متعدد بار تباہ کر دینے کی استعداد رکھتے ہیں جہاں نت نئی ایجادات نے سہولتیں اور آسائشیں تو فراہم کی ہیں لیکن ساتھ ہی پوری انسانیت کو مہلک امراض میں بھی مبتلا کر دیا ہے اور زندگی سے جدّوجہد کی توانائی بھی چھین لی ہے جہاں انسان صرف اور صرف کسبِ معاش کے جائز ذرائع کے اختراع میں شب و روز مصروف ہے اور جہاں بڑائی کا معیار خوبصورت بنگلے، لمبی لمبی کاریں، رنگین ٹی وی اور وی سی آر ہوں وہاں زندگی کی اعلیٰ اقدار سر بہ گریباں اپنی بے قدری اور بے مائیگی پر ماتم نہ کریں تو اور کیا کریں کیونکہ مغربی دنیا میں سائنسی ترقی اس قدر تیز رفتاری سے وقوع پذیر ہو رہی ہے کہ ہم تیسری دنیا کے لوگ اس کو اپنے امکان میں لانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے اور اسی احساسِ محرومی نے ہمیں زندگی کی دوڑ میں اتنا پیچھے دھکیل دیا ہے کہ اب آگے قدم اٹھانے کا حوصلہ بھی باقی نہیں رہا۔

ایسے پُر آشوب دور میں ادب ہی ایک ایسا حوصلہ ہے جو زندگی کے مجروح جسد پر طمانیت کا مرہم رکھتا ہے۔ فکر و نظر کے مرجھائے ہوئے پودوں کی آبیاری کرتا ہے اور ایک ایسی نئی دنیا کی نشان دہی کرتا ہے جہاں تاریکیوں کے لیے روشنی، تشنگی کے لیے جوئے آبِ واماندگی

کے لیے چھتنار پیڑوں کی شفیق چھاؤں اور زہرہ گداز مایوسیوں کے لیے اُمید کا ایک جہانِ تازہ موجود ہے۔

شاعری ادب کی سب سے لطیف صنفِ اظہار ہے۔ یہ واقعہ اور امکان کے امتزاج کی ایک ایسی حسین نمو پذیری ہے جو وجدان، فکر و ادراک اور حسنِ بیاں کی منزلوں سے ایسے حیرت انگیز جہانوں کا پتہ دیتی ہے جو ہمیشہ سے ہی فکرِ انسانی کا مقصود رہے ہیں۔ انسانی روح کا اضطراب و اضطرار جب موزوں لفظوں کا پیرہن زیب تن کر لیتا ہے، جب زندگی کی حکایاتِ خوں چکاں لکھنے والوں کے ہاتھوں سے بہنے والا تازہ تازہ لہو حق کی آواز بن جاتا ہے اور جب نشاطِ غم اور غمِ نشاط کی کرب انگیز حقیقتیں اور گوناگوں کیفیتیں خود بے لباس ہو کر زندگی کے چہرے کا نقاب بھی اُلٹ دیتی ہیں تو شاعر کو آگہی کا ثمرہ مل جاتا ہے کیونکہ شاعری آگہی کا ثمر ہی تو ہے۔

زمین ذات اور کائنات کا مثلث شاعر کے اپنے اندر ہوتا ہے اور یہی مثلث اُسے مختلف رشتوں سے منسلک کرتا ہے اور سوچ کے مختلف زاویے عطا کرتا ہے اس کے اندر مرتسم ہونے والی اندرونی اور بیرونی کیفیات اور ذات و کائنات کے رشتوں کا ادراک جب اظہار چاہتا ہے تو وہ لکھنے لگتا ہے کوئی قوت اُسے لکھنے پر مجبور کرتی ہے اور شاعر ان تمام دکھوں اور خوشیوں کو محبتوں اور نفرتوں کو، کرب و غم اور طرب و نشاط کو لکھا جاتا ہے جو زندگی نے اُسے دیئے ہیں یا جو اُس نے محسوس کیے ہیں۔ واردات کا اظہار آورد کا محتاج نہیں۔ اکثر ہوتا ہے کہ مَیں لکھنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود کچھ نہیں لکھ پاتا اور اکثر نہ لکھنا چاہوں بھی تو "رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل"۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے شاید اس لیے کہ تخلیقی ادب التزامی نہیں الہامی ہوتا ہے اور اس کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔

شاعر نہ دانشِ عصر کا محتاج ہوتا ہے نہ عصری آگہی کا، کہ دانش اور آگہی کا معیار تو خود شاعر متعین کرتا ہے۔ شاعر مقررہ راستوں کا مسافر نہیں، مقررہ اور متعین راستوں پر چلنے والے تو مقلد ہوتے ہیں۔ شاعر روز ایک نیا راستہ تراشتا ہے اور اس پر لوگوں کو چلتا ہوا چھوڑ کر خود آگے بڑھ جاتا ہے ایک نئے راستے کی تشکیل کے لیے کسی اور منزل کی تلاش میں، اور یہ تجسس کا سفر زندگی بھر جاری رہتا ہے۔ جو اس سفر کو ترک کر دیتا ہے وہ غیر طبعی موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

شاعری کا اسلوب خوبصورت پیرہن کا متقاضی ہے شاعری دراصل سراپا جمال ہے اور غزل اُردو شاعری کی سب سے زیادہ نازک طبع، کامنی پیکر، خوش اندام صنف سخن ہے جس کے جمال کی پاسبانی شاعر کے لیے بہر طور لازم ہے۔ یوں تو لباس کی تراش خراش بدلتی رہتی ہے یہاں تک کہ بدہیتی و بد وضعی بھی فیشن کا حصہ بن جاتی ہیں۔ لیکن یہ فیشن عارضی ہوتا ہے کہ حُسن کے معیارات تو مسلمہ طور پر طے ہیں۔ بدہیتی و بد وضعی تو ایک طرح کی اقدار سے بغاوت کا بے باکانہ اظہار ہے جو جلد ترک بھی کر دیا جاتا ہے استقلال تو صرف حسن کو حاصل ہے ادب میں تجریدی بدہیتی ذہنی انتشار کا ایک اظہار ہے اور جو جتنا بکھرا ہوا ہوتا ہے وہ تجریدیت میں اتنا ہی کامل۔ ہمارا انتشار بے چہرگی اور تجریدیت ہمارے موجودہ دَور کے تضادات کا بھی مظہر ہیں۔ جو اپنے تخلیقی تجسّس میں عصری آگہی یا دانشِ حاضر سے مرعوب ہو جاتے ہیں وہی ان تضادات میں گُم بھی ہو جاتے ہیں۔ شاعر کی نظر تو آگے کے زمان و مکان پر ہونی چاہیئے۔ ان امکانات پر جو سیاہ عصبیتوں میں خیر کی روشنی کی بشارت دیتے ہیں۔ جو زندگی کو ہمہ پہلو سمجھتے ہیں اور اس کے ہر رخ کو اپنی شاعری کا کل قرار دیتے ہیں۔ جو ذہنی بے راہ روی سے شاعری کو بے منزلت کا رِتخلیق نہیں بناتے بلکہ فکر کی ان بلندیوں کو اجاگر کرتے ہیں جو نئی جہتوں اور نئی منزلوں سے آشنا کرے۔

شاعری کا یہی سفر منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔ موج موجِ تشنگی میرا پہلا مجموعہ کلام تھا جو آٹھ سال قبل کتابِ تعارف کے طور پر شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ میری دوسری کاوش ہے اس کے بعد شکسپیر کے ڈرامے "مڈسمر نائٹ ڈریم" کا منظوم ترجمہ کرنے کی جسارت کی ہے جو جلد طبع ہو کر سامنے آجائے گی اور اس کے بعد نظموں اور دوہوں کا ایک مجموعہ۔ اور اس طرح میرا تخلیقی عمل جو ابھی آغازِ سفر کی اوّلین منزلوں میں ہے جاری و ساری دکھائی دے گا یہی تسلسلِ فکر شاعری کی زندگی ہے۔ یہی میری آگہی کا ثمرہ ہے میرے ادراک کا وظیفہ اور میرے مطالعے و مشاہدے کا مربُوط اظہار۔

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

عالمتاب تشنہ

۶ ستمبر ۱۹۸۵ء

سفر میں راہ کے آشوب سے نہ ڈر جانا
ملے جو آگ کا دریا تو پار کر جانا

یہ اک اشارہ ہے آفاتِ ناگہانی کا
کسی جگہ سے پرندوں کا کوچ کر جانا

یہ انتقام ہے، دشتِ بلا سے بادل کا
سمندروں پہ برستے ہوئے گزر جانا

تمہارا قرب بھی دوری کا استعارہ ہے
کہ جیسے چاند کا تالاب میں اُتر جانا

عجب ہیں رزم گہہِ زندگی کے یہ انداز
اُسی نے وار کیا جس نے بے سپر جانا

ہر اک نفس پہ گزرتا ہے یہ گماں جیسے
چراغ لے کے ہواؤں سے جنگ پہ جانا

ہم اپنے عشق کی اب اور کیا شہادت دیں
ہمیں ہمارے رقیبوں نے معتبر جانا

مرے یقیں کو بڑا بدگمان کر کے گیا
دعائے نیم شبی تیرا بے اثر جانا

ہر ایک شاخ کو پہنا گیا نمو کا لباس
سفیرِ موسمِ گُل کا شجر شجر جانا

ہمارے دم سے ہی آوارگیِ شب تھی ہمیں
عجیب لگتا ہے اب شام ہی سے گھر جانا

زمانہ بیت گیا ترکِ عشق کو تشنہ
مگر گیا نہ ہمارا اِدھر اُدھر جانا

••

بسائے جائیں جو دل سے وہ گھر اُجڑتے نہیں
زمیں میں جن کی جڑیں ہیں وہ پیڑ اُکھڑتے نہیں

نہ جانے کون سے کوچے سے ہو کے آئی ہے
صبا کے پاؤں ابھی تک زمیں پہ پڑتے نہیں

گنتی میں بے شمار تھے کم کر دیئے گئے
ہم ساتھ کے قبیلوں میں ضم کر دیئے گئے

پہلے نصابِ عدل ہوا ہم سے انتساب
پھر یوں ہوا کہ قتل بھی ہم کر دیئے گئے

پہلے لہو لہان کیا ہم کو شہر نے
پھر پیرہن ہمارے علم کر دیئے گئے

ہر دور میں رہا یہی آئینِ منصفی
جو سر نہ جُھک سکے وہ قلم کر دیئے گئے

اِس دورِ ناشناس میں ہم سے عرب نژاد
لب کھولنے لگے تو عجم کر دیئے گئے

جب درمیاں میں آئی کمالِ بشر کی بات
ہفت آسمان زیرِ قدم کر دیئے گئے

پہلے ہی کم تھی قریۂ جاناں میں روشنی
اور اس پہ کچھ چراغ بھی کم کر دیئے گئے

تشنہؔ جو لفظ مصلحتاً ہم نہ کہہ سکے
دیوارِ وقت پر وہ رقم کر دیئے گئے

جدھر بھی دیکھتا ہوں، اک تحیّر ہے، تماشا ہے
خدایا کس سے پوچھوں آئینے کے اُس طرف کیا ہے

سُنا ہے قریۂ جاں سے ہے آگے کوچۂ جاناں
مگر یہ راستہ آشوبِ جاں سے ہو کے جاتا ہے

تم اپنے دل کی ویرانی سے آنکھیں مت بجھا لینا
دریچے ہوں اگر روشن تو گھر آباد لگتا ہے

طنابِ خیمۂ جاں کھینچ لیں سب قافلے والے
سکوتِ شب یہ کہتا ہے کہ پھر طوفاں کا خطرہ ہے

ابھی تو راستوں کی تجھ سے ہوتی ہے حنا بندی
ابھی اے آبلہ پائی تجھے کانٹوں پہ چلنا ہے

غبارِ راہ کیا ہم تو تھکن بھی چھوڑ آئے ہیں
ہمیں آتا ہے تکمیلِ سفر کا جو قرینہ ہے

ہمیں ساحل پہ رکھو یا سرِ گرداب چھوڑ آؤ
یہ کشتی بھی تمہاری ہے، یہ دریا بھی تمہارا ہے

ہمیں اک سوختہ ساماں نہیں، تنہائی شب میں
چراغِ آخرِ شب بھی ہمارے ساتھ جلتا ہے

کتابوں کا لکھا تو عمر بھر تم نے پڑھا تشنہ
ذرا وہ بھی تو پڑھ لیتے جو دیواروں پہ لکھا ہے

سوادِ جاں میں نہ یوں در بہ در پھرا مجھ کو
مسافرت مرے گھر کا پتہ بتا مجھ کو

مجھے تو اپنے خد و خال تک بھی یاد نہیں
دیارِ خود نگری آئینہ دکھا مجھ کو

میں اپنے ظرف کی حد سے نکل نہ جاؤں کہیں
مری انا مرے قامت سے مت بڑھا مجھ کو

چراغ میں بھی تھا اور روشنی بھی رکھتا تھا
بجھا گئی ہے ترے شہر کی ہوا مجھ کو

لبوں پہ حرفِ تمنّا کا عکس آنے لگا
دکھا رہا تھا کوئی دِل کا آئینہ مجھ کو

نہ جانے کتنے اُجالوں کا ہے بھرم مجھ سے
چراغِ خانۂ مفلس ہُوں مت بُجھا مجھ کو

ہلا تو قصۂ ہجر و وصال لے بیٹھا
کہاں کہاں کے فسانے سُنا گیا مجھ کو

لہو میں جیسے وہ جگنو پکڑ کے چھوڑ گیا
کچھ ایسا کُھل کے ہلا، جگمگا گیا مجھ کو

درِ خیال پہ دستک کا تھا وہی انداز
ہوائے یاد کا جھونکا رُلا گیا مجھ کو

عجیب شخص تھا تشنہ حریفِ جاں ہوکر
محبتوں کا سلیقہ سِکھا گیا مجھ کو

○○○

شام ہوتے ہی یہ کیوں ٹوٹنے لگتا ہے بدن
کیوں ہواؤں سے شرابوں کی مہک آتی ہے

گُل کھِلا دیتا ہے دل میں تیرا اندازِ کلام
تیری باتوں سے گلابوں کی مہک آتی ہے

نیند میں اُڑتے ہیں تعبیر کے جُگنو تشنہ
جاگتی آنکھوں سے خوابوں کی مہک آتی ہے

موجِ ہوائے یادِ نگاراں رات گئے جب چلتی ہے
تارِ نفس میں بَل پڑتے ہیں جسم سے جان نکلتی ہے

توڑتا ہے زنجیرِ قیودِ قسمت کو مجبورِ خرام
ذوقِ سفر کی محرومی راتوں کو نیندیں چلتی ہے

پھر ہوتا ہے حشرِ تماشا پھر ہوتی ہے صبحِ ازل
نشّہ پیکرِ بادۂ ہستی جامِ سفال میں ڈھلتی ہے

وہ میرے پہلو میں جب بیٹھا تو یہ محسوس ہُوا
ساحل کی ہم آغوشی میں جیسے موج مچلتی ہے

جوگ لیا ہے سب گلشن نے سوگ میں ہجرِ بہاراں کے
ٹہنی ٹہنی صحنِ چمن میں زرد لباس بدلتی ہے

اُٹھ جائے گا برسرِ محفل پردۂ ظرفِ مے نوشی
دیکھنا یہ ہے پی کر دنیا گرتی ہے کہ سنبھلتی ہے

کیسی آنکھیں پھیر لیں ہم سے سارے آہو چشموں نے
وقت بدلتے ہی یہ دنیا کیسا رنگ بدلتی ہے

میں ہی وہ مہتاب قدم ہوں کاہکشاں در کاہکشاں
گردشِ ہفت افلاک بھی جس کی ہمراہی میں چلتی ہے

تشنہ فراقِ یار کی راتیں ہوتی ہیں آہستہ خرام
شمع دیارِ جاں سوزی میں دھیمے دھیمے جلتی ہے

پہلے دِل اختیار میں رکھنا
پھر قدم کوئے یار میں رکھنا

چل رہی ہے ہوائے شب آثار
روشنی کو حصار میں رکھنا

لوگ کیوں تیرگی میں ہوں مصلوب
اِک دیا طاقِ دار میں رکھنا

کچھ تو آسان ہو مسافتِ شب
اک دیا رہگذار میں رکھنا

تم کو مرہم نظر بنایا ہے
زخم سارے شمار میں رکھنا

کچھ تو خوئے سفر نوازی بھی
شجرِ سایہ دار میں رکھنا

باندھنا روز اک قرار نیا
ہم کو قول و قرار میں رکھنا

کر کے تجدیدِ وعدۂ فردا
عمر بھر انتظار میں رکھنا

عکسِ جاں کو سمیٹ کر تشنہ
دستِ آئینہ دار میں رکھنا

ٹھہرے ہوئے طوفان کا منظر نہیں دیکھا
دیکھو مجھے گر تم نے سمندر نہیں دیکھا

گزرا ہوا لمحہ تھا کہ بہتا ہوا دریا
پھر میری طرف اُس نے پلٹ کر نہیں دیکھا

نفرت بھی اُسی سے ہے پرستش بھی اُسی کی
اس دِل سا کوئی ہم نے تو کافر نہیں دیکھا

اِک دشت بلا کوچۂ جاناں سے نکل کر
ہم نے تو کبھی عشق کو بے گھر نہیں دیکھا

تھے سنگ تو بے تاب بہت نقش گری کو
ہم نے ہی انہیں آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا

خواہش کو یہاں حسبِ ضرورت نہیں پایا
حاصل کو یہاں حسبِ مقدّر نہیں دیکھا

اک بار جسے دیکھ لیا پیار سے تم نے
پھر اس کا قدم ہم نے زمیں پر نہیں دیکھا

کیا ڈوبنے والے پہ گزرتی ہے قیامت
تم نے تو یہ ساحل سے بھی منظر نہیں دیکھا

اک عمر سے ہے جو مری وحشت کا ٹھکانا
خوشیوں کی طرح تُو نے بھی وہ گھر نہیں دیکھا

کیا ہو گئے ہم عشق میں، اُس کو بھی خبر ہو
کیوں ہم سے زمانے نے الجھ کر نہیں دیکھا

دعویٰ تو بہت اُس نے کیا ہم سفری کا
دو گام مگر ساتھ نبھا کر نہیں دیکھا

ہر حال میں دیکھا ہے اُسے ضبط کا پیکر
تشنہ کو کبھی ظرف سے باہر نہیں دیکھا

رات ہوائے درد کا زور کوئی چلا نہیں
ٹوٹی نہیں طنابِ دل خیمۂ جاں گِرا نہیں

غم کی سناں ہے روز و شب جاں کو ہدف کیے ہوئے
دردِ دلِ جنوں نصیب چین سے بیٹھتا نہیں

طائرِ مشتِ خاکِ پَر یوں نہ فضاؤں میں بکھر
بیٹھ جا پاتے دشت میں تیرے لیے فضا نہیں

وہ رُخِ ماہِ نیم ماہ روشنیٔ دلِ و نگاہ
کوئی چراغِ شب فروز اس کی مثال کا نہیں

ہم سے خزاں خراب کو عیشِ بہار سے غرض
ہم ہیں وہ سعیٔ رائیگاں جس کا کوئی صلہ نہیں

جو بھی ہے مانگنا مجھے اس کی ہے سب خبر اُسے
ہاتھ اُٹھے ہوئے تو ہیں لب پہ کوئی دعا نہیں

طائرِ آسماں شکار ہو گیا آشیاں نگر
بیٹھا ہے پر سمیٹ کر اُڑنے کا حوصلہ نہیں

یارِ ضرر رساں بھی چپ دشمنِ مہرباں بھی چپ
کب سے ہوں گوش بر صدا کوئی پکارتا نہیں

تشنۂ غمِ حیات نے جان ہی کھینچ لی مری
جیسے خدا نخواستہ میرا کوئی خدا نہیں

ساری دُنیا سے پناہیں مانگتا رہ جائے گا
بے یقیں مت ہو کہ تُو بے آسرا رہ جائے گا

دشت کی اِس دُھوپ میں جل جائے گا تیرا وجود
تیرے قدموں پر ترا سایہ پڑا رہ جائے گا

کارواں تو خیر کیا دیکھے گا مڑ کر تیری سمت
تُو غبارِ کارواں کو دیکھتا رہ جائے گا

اِک ہجومِ عکس ہوگا آئینہ در آئینہ
اپنے چہرے کو بھی تُو پہچانتا رہ جائے گا

نوکِ مژگاں، تارِ جاں پر لاکھ مضرابی کرے
پھر بھی حسن و عشق میں اِک فاصلہ رہ جائے گا

بھول جائیں گے یہ ساری انجمن آرائیاں
یاد بس اپنے ہی گھر کا راستہ رہ جائے گا

وہ تو خوشبو کا ہیولا ہے، سرِ دوشِ ہوا
تُو اُسے محسوس ہی کرتا ہوا رہ جائے گا

ہر قدم پر کام آئے گی انا کی روشنی
آندھیوں کے درمیاں بس یہ دِیا رہ جائے گا

تشنہ اب وہ تیری آوارہ شبی کے دن گئے
جانے کس کس گھر کا دروازہ کھُلا رہ جائے گا

خشک پتّے جو بہاروں میں شجر پہ رہ جائیں
پھول انجامِ نمو دیکھیں تو ڈر کر رہ جائیں

آپ یہ شملہ و دستار سنبھالیں نہ بہت
عافیت جانیے، شانوں پہ اگر سر رہ جائیں

کارِ آساں نہیں کچھ راہِ وفا پر چلنا
جان پیاری ہے جنہیں شوق سے گھر پہ رہ جائیں

ہم نے اس خوف سے دیکھا نہیں پیچھے مڑ کر
سحرِ آواز سے پتّھر ہی نہ بن کر رہ جائیں

اُن سے پُوچھو کِسے منزل کا اَلَم کہتے ہیں
جو سرِ سایۂ دیوار پہنچ کر رہ جائیں

عہدِ کوتاہ قداں میں یہ غنیمت ہے بہت
ہم اگر اپنے ہی قامت کے برابر رہ جائیں

اتنی بڑھ جائے نہ تشنہ کہیں ویرانیٔ شہر
سر نہ باقی رہیں اور ہاتھ میں پتّھر رہ جائیں

آئینہ خانہ بھی اندوہِ تمنّا نکلا
غور سے دیکھا تو اپنا ہی تماشا نکلا

زندگی محفلِ شب کی تھی بس انداز شراب
پینے بیٹھے تو بس اک گھونٹ ذرا سا نکلا

پھر چلا موسمِ وحشت میں سرِ مقتلِ عشق
قرعۂ فال مرے نام دوبارہ نکلا

دادِ شائستگیٔ غم کی توقّع بے سُود
دِل بھی کم بخت طرف دار اُسی کا نکلا

ہے عجب طرز کا رہرو، دلِ شوریدہ قدم
جب بھی نکلا سفرِ عشق پہ تنہا نکلا

وہ رقیبوں کا پتا پوچھنے آیا مرے گھر
کوئی تو اُس سے ملاقات کا رستہ نکلا

دربدر خوار ہوئے پھرتے ہیں ہم ہجر نصیب
جاں سپاری کا بھی کیا خوب نتیجہ نکلا

دِل میں اُٹھتے رہے یادوں کے بگولے تشنہ
مجھ میں سمٹا ہوا، اک درد کا صحرا نکلا

رُکنا تو خیالوں میں مصروفِ سفر رہنا
آیا ہی نہیں ہم کو آرام سے گھر رہنا

کیا حال بنایا ہے یہ تم نے محبت میں
یہ چاکِ گریبانی یہ خاک بسر رہنا

گر ترکِ تعلّق ہی ہوتا ہے تو ہو جائے
اچھّا تو نہیں دِل کو ہر وقت کا ڈر رہنا

جس سمت نظر ٹھہرے تم پر ہی نظر ٹھہرے
رہنا مری نظروں میں تا حدِّ نظر رہنا

اک لفظ محبّت کا ہونٹوں پہ چمک اُٹھنا
پھر رنگِ حیا بن کر عارض پہ بکھر رہنا

بچھڑا جو محبت میں الزام تمہیں دے کر
اب اُس کے خیالوں میں تم شام و سحر رہنا

رُک جانے سے ہوتا ہے کچھ اور سفر مشکل
کیا دھوپ سے گھبرانا، کیا زیرِ شجر رہنا

وعدوں کو وفا کرنا، عادت ہی نہیں اُسکی
مت راہ میں تو اُس کی اے دیدۂ تر رہنا

اک ہم سے ہی مت رکھنا بس کوئی تعلق تم
اور سارے زمانے کے محبوبِ نظر رہنا

میں اپنی دعاؤں کی دیتا ہوں سپر تم کو
تم چاہے جہاں رہنا بے خوف و خطر رہنا

برسات کی شاموں کا منظر ہے یہی تشنہ
کاجل بھری آنکھوں میں اشکوں کے گہر رہنا

••

ان کے رُو برُو کرتے درد تم بیاں اپنا
کربِ شامِ غم اپنا حالِ زارِ جاں اپنا

ہم بھی اک بلندی سے دیکھتے یہ ہنگامے
یہ زمیں تری ہوتی اور آسماں اپنا

چشمِ نشّہ آفریں خوابِ شبِ رفتہ سے ہے
حال کی آئینہ داری حیرتِ فردا سے ہے

گرمیِ بازارِ عالم عشقِ بے مایہ سے ہے
انجمن آرائیِ دنیا دلِ تنہا سے ہے

کار فرما جُزو کے ہر جوہر میں ہے کُل کی صفت
موج کی گرداب سامانی رمِ دریا سے ہے

جامِ بے مے قدر میں اک کوزۂ بے منزلت
شعلۂ مینا فروغِ نشۂ صہبا سے ہے

عشق کی مہمیز کو روکے ہوئے ہے احتیاط
رخشِ وحشت کو شکایت تنگیِ صحرا سے ہے

خوفِ شب خونِ جنوں نے چھین لی راتوں کی نیند
قافلے کی بے پناہی ناقۂ لیلیٰ سے ہے

درد کے گرداب میں ہے اک دلِ طوفاں نصیب
کشتیِ بے بادباں کو واسطہ دریا سے ہے

ہے سفر منت کشِ موجِ تغیّر آشنا
کارواں بے سمت و بے منزل ہوا پیما سے ہے

کور چشمی کے لیے تو ایک ہیں سرخ و سفید
یہ شعورِ رنگِ دنیا دیدۂ بینا سے ہے

لوحِ قسمت کا لکھا ہے عشق میں ہجر و وصال
کب شکایت آپ سے ہے کب گلہ دنیا سے ہے

چھوڑتا ہے جیسے رگ رگ میں کوئی مہتابیاں
موجِ خوں میں سیلِ آتش شعلۂ بادہ سے ہے

یوں تو اک اورنگِ استعجاب ہے دنیا تمام
اعتبارِ عکسِ جاں اک آئینہ سیما سے ہے

ورنہ کیا رکھا ہے گلشن میں سوائے خار و خس
سرو کو زیبائی اس کے قامتِ بالا سے ہے

جس سے بھی ملتا ہے ہوتا ہے طلبگارِ وفا
یہ دلِ سادہ نفس نا آشنا دنیا سے ہے

عکس اپنا دیکھنا بھی کب گوارا ہے اُسے
آئینہ بھی غرقِ حیرت حُسنِ بے پروا سے ہے

اشک آنکھوں میں سرشکِ غم سے ہیں آتے ہوئے
ریگِ ساحل کی نمی جوششِ کفِ دریا سے ہے

خواہشِ صد برگ سے ہے موسمِ گل پیرہن
رونقِ ہر میکدہ سرمستیٔ تشنہ سے ہے

•

ٹپکا ہے رگِ جاں کا لہو دیدۂ تر سے
جب لوحِ محبّت پہ لکھا ہے ترا پیکر

بیٹھا ہوں جاں سپرد کیے یار کے قریب
جس طرح کوئی سر رکھے تلوار کے قریب

کل رات روشنی کا کرشمہ تھا دیدنی
جلتا تھا اِک چراغ رُخِ یار کے قریب

ہم کو بھی بیٹھنے کے لیے مِل گئی جگہ
اُس کی گلی میں سایۂ دیوار کے قریب

شوریدگیٔ اہلِ محبّت کو چاہیے
کوچہ اک اور کوچۂ دلدار کے قریب

پڑنے لگا سیاستِ درباں سے واسطہ
پہنچے تھے مشکلوں سے درِ یار کے قریب

اِک تو ہی کیا یہاں تو کسی کو خبر نہیں
بیٹھا ہے کون کیوں تری دیوار کے قریب

تشنہ مباحثِ گُل و عارض بھی ہوں تمام
رکھ دیکھئے گلاب بھی رخسار کے قریب

کچھ ضروری نہیں ہر اشک کا گوہر ہونا
ہر تماشے کو میسّر نہیں منظر ہونا

ایک آنسو میں ہوئیں ڈوب کے قلزم آنکھیں
باور آیا ہمیں قطرے کا سمندر ہونا

سرکشیدہ ہیں گلستاں میں بہاریں تجھ سے
تیرے قامت پہ سجا سرو و صنوبر ہونا

میں بھی دریا کی طرح آؤں گا چل کر تم تک
ظرف میں تم بھی سرِ شام سمندر ہونا

ہم نے پسپائی بھی دیکھی ہے سو ہم جانتے ہیں
کوئی آساں نہیں ہارا ہوا لشکر ہونا

باز رکھتا ہے سُنانے سے ہمیں حال اپنا
قصۂ عشق کے ہر لفظ کا دفتر ہونا

زخم لفظوں سے بھی لگ جاتے ہیں نشتر کی طرح
تم نے خود دیکھ لیا پھول کا پتھر ہونا

اُن در و بام کی حسرت نہیں دیکھی جاتی
جن کی تقدیر میں لکھّا ہے مرا گھر ہونا

یہی اک رسم ہے تشنہ سرِ دربارِ ستم
واجب دار ہے، دستار کا سر پہ ہونا

حدِّ سفر کو سدِّ سکندر کہا گیا
مجبوریِ عمل کو مقدّر کہا گیا

پانی کی وحشتوں کا بھنور نام پڑ گیا
دریاؤں کی لحد کو سمندر کہا گیا

سورج لہو ہوا تو شفق پھوٹنے لگی
آغازِ شب کو شام کا منظر کہا گیا

ڈالے گئے شگاف دریچوں کے نام پر
دیوار کا تھا زخم جسے در کہا گیا

اپنی ہی عیب پوشی کو پوشاک کر لیا
تہذیب کا تھا جبر جسے گھر کہا گیا

ذوقِ نمو کو صبحِ ازل نام دے دیا
جشنِ ظہورِ ذات کو محشر کہا گیا

تشنہ تری غزل پہ یہ دادِ سخن شناس
سن کر ہر ایک شعر مکرر کہا گیا

آسکا نہ ہونٹوں پر حرفِ مدّعا اب تک
مرحلہ محبّت کا طے نہ ہو سکا اب تک

خوشبوئے شبِ رفتہ پیرہن سے اٹھتی ہے
آنکھ سے چھلکتا ہے رات کا نشہ اب تک

وہ ہوا کا جھونکا تھا جانے اب کہاں ہوگا
حد ہے اُس کے بارے میں میرا سوچنا اب تک

ہم سے شب پرستوں پر اب بھی ہے کرم اُس کا
بھیجتا ہے دُنیا پر روشنی خدا اب تک

روز کی مُلاقاتیں ، اور دیر تک شب باتیں
یاد کر کے روتا ہے دِل وہ سلسلہ اب تک

اُس کے نرم قدموں کی چاپ ہے خیالوں میں
دِل کی رہگزر پر ہیں اُس کے نقشِ پا اب تک

ترکِ عشق کا تم سے غم اُسے بھی ہے تشنہ
محفلوں میں رہتا ہے وہ اُداس سا اب تک

بین اور ناگن کا رسیا ہوں
پیار کی بامبی میں رہتا ہوں

اپنے خوابوں کے دروازے
کب سے بند کیے بیٹھا ہوں

دِیا اندھیرے بانٹ رہا تھا
میں بھی جھولی بھر لایا ہوں

ہرا بھرا ہے لان کا سبزہ
اندر سے میں سوکھ رہا ہوں

گھر میں آنگن بھی ہوتا تھا
اب تو میں یہ بھول چکا ہوں

آج بھی یہ معلوم نہیں ہے
میں کس کس کا ہمسایہ ہوں

اب تو ایک سزا باقی ہے
عمرِ محبت کاٹ چکا ہوں

مجھے بجھانا کھیل نہیں ہے
میں تو چراغِ شہرِ ہوا ہوں

اِک دشتِ آرزو ہے کہ پھیلا ہے دُور تک
اور رہ روانِ شوق کو جانا ہے دُور تک

اب تُو نہ تیرے قُرب کی خوشبو نہ کیفِ شب
اک بے کنار ہجر کا صحرا ہے دُور تک

لَو آخری دموں پہ ہے اے خستگانِ شب
بُجھتے ہوئے چراغ کا سایہ ہے دُور تک

وہ دشتِ بے اماں ہے کہ سایہ نہ سائباں
سُورج نے اپنا جال بچھایا ہے دُور تک

قدموں کی چاپ آتی رہی دیر تک مجھے
جیسے مجھے منانے وہ آیا ہے دُور تک

یہ عالمِ خیال ہے یا عالمِ مثال
اپنی ہی خواہشوں کا تماشا ہے دُور تک

وہ کاروانِ رنگ تھا گزرا چلا گیا
آنکھوں نے گردِ راہ کو چُوما ہے دُور تک

تشنہ ذرا سفینۂ جاں کو سنبھالنا
سیلاب کے حصار میں دریا ہے دُور تک

تھے کبھی قافلۂ سرو وسمن میں ہم بھی
رقص کرتے ہوئے آتے تھے چمن میں ہم بھی

یہ الگ بات کسی پیڑ سے منسوب نہیں
برگِ آوارہ سہی ہیں تو چمن میں ہم بھی

ہیں فصیلوں پہ ہمارے بھی لہُو کے چھینٹے
تھے کبھی کشمکشِ دار و رسن میں ہم بھی

حکمِ آزادیٔ گفتار ہمیں بھی دیجے
اِک زباں رکھتے ہیں زندانِ دہن میں ہم بھی

شہرِ ناقدر شناساں میں ہوئے ہیں بے مول
لعلِ نایاب تھے بازارِ یمن میں ہم بھی

ہم نے بھی تیرے خد و خال کے قِصّے لکھے
معتبر ہو گئے اقلیمِ سخن میں ہم بھی

رات بھر لکھتے رہے قوسِ قزح کا مضموں
رنگ بھرتے رہے تصویرِ بدن میں ہم بھی

ہم کو بھی عشق کا دعویٰ ہے گُلوں سے تشنہ
چُن دیئے جائیں گے دیوارِ چمن میں ہم بھی

مری طرح سرِ محفل اُداس تھا وہ بھی
کسی نے حال جو پوچھا تو رو دیا وہ بھی

ہوائے شام کی جس سے شکایتیں کی تھیں
چراغِ بامِ تمنّا بُجھا گیا وہ بھی

جو دے گیا تھا خبر دشمنوں کے شب خوں کی
مِرے مکاں پہ نشانی لگا گیا وہ بھی

خیالِ طعنۂ یاراں نہ خوفِ رُسوائی
ہر اک سفر میں مرے ساتھ تھا وہ بھی

نیا نیا تھا ہمیں بھی جنوں پرستش کا
بنا ہوا تھا سرِ انجمن خُدا وہ بھی

کرے گا کون اب آشوبِ ذات کا ماتم
اک آدمی تھا جو مجھ میں سو مر گیا وہ بھی

ہمیں بھی ایک ہی موسم کا تھا دماغ کہاں
ہر ایک عہدِ وفا سے مُکر گیا وہ بھی

رفاقتوں کا صلہ یہ بھی کم نہیں تشنہ
ہمارا نام جب آیا تو ہنس پڑا وہ بھی

کس دشت کو جا نکلیں اب کون سے گھر جائیں
ہم کوچۂ جاناں سے جائیں تو کدھر جائیں

اس ساعتِ شب گوں میں لَو دے کوئی دل شاید
لہجے میں چراغوں کے ہم بات تو کر جائیں

بیتے ہوئے موسم کی کچھ پھول سی یادیں ہیں
مرہم نظرو دیکھو یہ زخم نہ بھر جائیں

بے ساحل و بے طوفاں یہ کشتیِ جاں کب تک
یا ڈوب کے رہ جائیں یا پار اُتر جائیں

ہر حال میں کرتے ہیں رستے تو پذیرائی
ہم تاج بہ سر گزریں یا خاک بہ سر جائیں

آ جائیں ہمیں بھی کچھ آدابِ محبّت کے
الجھیں تری زلفوں میں ایسے کہ سنور جائیں

اے کاش ہمیں آئے یہ خاص ہُنر اُن کا
خود عہدِ وفا باندھیں اور صاف مُکر جائیں

بچپن کا وہ شہزادہ کیا یاد نہیں تشنہ
ملنے اُسی بالک سے ہم خیر نگر جائیں

اس کی گلی سے چند قدم پر اپنا گھر آباد کیا
ہم نے بھی کس آبادی میں خود کو جا برباد کیا

پہلے خس و خاشاک چُننے پھر جانے دل میں کیا آئی
سارا کارِ آشیاں بندی نذرِ ابر و باد کیا

ترکِ تعلّق پر بھی اس سے اتنا تعلّق باقی ہے
تارے کئی افلاک پہ ٹوٹے جب بھی اس کو یاد کیا

دامنِ گل کو چاک کیا اور قریہ قریہ پھیل گئی
سرگوشی میں خوشبو سے یہ صبا نے کیا ارشاد کیا

جاں داری و جاں سوزی ہے شیوہ عشق نصیبوں کا
اس کو دعائیں جس نے بھی یہ طرزِ وفا ایجاد کیا

تشنہ اس کا گھر آنگن ہو سدا بہاروں کا مسکن
یہی دعا ہے شاد رہے وہ جس نے مجھے برباد کیا

•

تا سحر جلتا رہا جو روشنی کے واسطے
اُس چراغ شعلہ سر کی داستاں ہو جائیے

لمحہ لمحہ عرصۂ جاں میں بکھرا ہے
سنگِ نفس سے شیشۂ ساعت ٹوٹا ہے

روشنیاں خوشبو لے کر اُڑ جاتی ہیں
پھونکوں سے یہ کون چراغ بجھاتا ہے

جینے کے آثار ابھی کچھ باقی ہیں
آئینۂ انفاس ابھی دھندلاتا ہے

ایک پرندہ کُھلی فضا میں اُڑنے کو
محبسِ جاں میں پَر پھیلائے بیٹھا ہے

بند اگر ہوں کان تو پھر اپنے اندر
طوفانوں کا شور سُنائی دیتا ہے

لہو کا ہر قطرہ ہے جیسے موجِ بلا
دِل میں اک طوفان سا برپا رہتا ہے

دیکھنے والی آنکھ کو آج کے پردے میں
کل کا منظر صاف دِکھائی دیتا ہے

جشنِ عیشِ گریہ آج منائیں ہم
اے تنہائی، وہ بھی آج اکیلا ہے

تشنہ تھا جو ہم دونوں کی راہگزر
اب وہ رستہ سُونا سُونا رہتا ہے

میری ایذا طلبی کا یہی خمیازہ ہے
دل کی ہر چوٹ ہری زخم ہنر تازہ ہے

عرصۂ جاں میں سمیٹوں میں کہاں تک تجھ کو
زندگی تیرا تو بکھرا ہوا شیرازہ ہے

ڈوب جاؤ گے تو ساحل نہ کبھی پاؤ گے
مجھ کو اُن آنکھوں کی گہرائی کا اندازہ ہے

تم کسی دِن اگر آ جاؤ تو مجھ پر بھی کھُلے
لوگ کہتے ہیں مرے گھر میں بھی دروازہ ہے

میرے لوگوں کو تعجب ہے یقیں سے بڑھ کر
شاخ سے ٹوٹ کر اب تک یہ ثمر تازہ ہے

چھُو لیا تم نے تو پہچان لیے جاؤ گے
دیکھنا روغنِ دیوار ابھی تازہ ہے

پھُول توڑا ہے ابھی دستِ صبا نے تشنہ
شاخِ لالہ پہ ابھی زخمِ نمو تازہ ہے

زیرِ آب بھی اک صحرا تو میں نے دیکھا
دُھوپ میں دریا خشک ہُوا تو میں نے دیکھا

پس منظر میں کتنے منظر ہوتے ہیں
مجھ پہ طلسمِ دید کھُلا تو میں نے دیکھا

جال، مچھیرے، کشتی سب ناپید ہُوئے
دریا، ساحل سے اُترا تو میں نے دیکھا

تاریکی میں ایک دِیا، سرِ بام ہوا
روشنیوں کا سر اونچا تو میں نے دیکھا

اپنی گردِ قافلۂ جاں رقص میں تھی
ایک بگولہ جب گزرا تو میں نے دیکھا

سنّاٹا تھا آوازوں کا پاگل پن
خاموشی کا بھید کھُلا تو میں نے دیکھا

موسمِ گل کی آمد کا ہر شاخ پہ رقص
ہوا کا اک جھونکا آیا تو میں نے دیکھا

رات کے بام و در پر لرزہ طاری تھا
تاریکی میں دیا جلا تو میں نے دیکھا

رات کے سارے منظر، میرے اپنے تھے
جب آنگن میں چاند اُترا تو میں نے دیکھا

اِک سایہ سا گہری نیلی آنکھوں میں
اُس نے میرا نام لیا تو میں نے دیکھا

عذرِ حیا تو محفل تک کا قصّہ تھا
پیچِ زلفِ یار کُھلا تو میں نے دیکھا

سُلگ رہا تھا وہ بھی میری چاہت میں
اُس نے دل کا حال کہا تو میں نے دیکھا

کس کو نہیں تکمیلِ محبّت کی خواہش
تنہائی میں جب وہ کُھلا تو میں نے دیکھا

عشق کی راہ پہ چلنا کتنا مشکل ہے
تشنہؔ میں دو گام چلا تو میں نے دیکھا

دردکی اِک لہر بل کھاتی ہے یوں دل کے قریب
موجِ سرگشتہ اُٹھے جس طرح ساحل کے قریب

ماسوائے کارِ آہ و اشک کیا ہے عشق میں
ہے سوادِ آب و آتش دیدہ و دل کے قریب

درد میں ڈوبی ہوئی آتی ہے آوازِ جرس
گریۂ گم گشتگی سنتا ہوں منزل کے قریب

آرزوئے نایافت کی ہے سِلسلہ درسِلسلہ
ہے نمودِ کربِ لاحاصِل بھی حاصِل کے قریب

کچھ تو اے نظارگانِ عیشِ ساحل بولیئے
کشتیاں کتنی ہوئیں غرقاب ساحل کے قریب

ہے ابھی واماندگی کو اک سفر درپیش اور
ہے ابھی افتادِ منزل اور منزل کے قریب

مرگِ حسرت کا تماشا دیکھنا تھا گر تمہیں
رقص آخر دیکھتے تم آکے بسمل کے قریب

ہیں وہ سب تشنہ سرِ منزل امیرِ کارواں
جو ملے تھے کارواں سے آکے منزل کے قریب

شکستِ شیشۂ دِل کی صدا ہُوں
میں خود بھی خود کو سُننا چاہتا ہوں

نہیں میرے لیے کیا اور کوئی
اُسی کا راستہ کیوں دیکھتا ہوں

اُسی ساحِل پہ ڈوبوں گا جہاں سے
سمندر کا تماشا کر رہا ہوں

چراغِ شعلہ بسر ہوں اور ہوا میں
سرِ دیوارِ جاں رکھا ہوا ہوں

گزرنا ہے جسے صحرا سے ہو کر
میں اُس دریا کے دُکھ سے آشنا ہوں

وصالِ یار کی خواہش میں اکثر
چراغِ شام سے پہلے جلا ہوں

غنودہ ساعتوں کی شب ہے تشنہ
طوافِ عارض و لب کر رہا ہوں ۔

اِن خواب نگار آنکھوں میں تری کاجل سا چراغِ شام کا ہے
ہر موسم تیری نسبت سے، ہر منظر تیرے نام کا ہے

دِن ڈھلا تو شب کے بستر پر، تری زلف کی افشاں بکھر گئی
یہ دُنیا جس کو چاند کہے، اک دِیا وہ تیرے بام کا ہے

ہاتھوں کے حصار میں لَو رکھنا، ہیں روشنیوں کے عدو بہت
اِس تیز ہوا کے موسم میں مجھے دھڑکا چراغِ شام کا ہے

کوئی لے کر آئے تازہ ہوا، کوئی جھونکا ٹھنڈے موسم کا
یہ لمحے بڑے آشوب کے ہیں، یہ وقت بڑے آلام کا ہے

اُسے اپنے رستوں چلنا تھا، اُسے جانا تھا، وہ چلا گیا
پل دو پل کی ہم سفری تھی، اب رونا صبح و شام کا ہے

اس قصۂ غم کا غم نہ کرو، تم اپنی آنکھیں نم نہ کرو
یہ حال اُسی بے حال کا ہے، یہ نام اُسی بدنام کا ہے

سُنتے ہیں کہ تشنہ تیری غزل، مقبول ہے ماہ رخوں میں بہت
کہتے ہیں کہ شہر نگاراں میں بڑا شہرہ تیرے کلام کا ہے

سفر نواز تو کوئی شجر نہیں آیا
کہیں بھی دشت میں سایہ نظر نہیں آیا

جو آئینے سے مجھے مسکرا کے دیکھتا تھا
بہت دنوں سے وہ چہرہ نظر نہیں آیا

اُسی کو ڈھونڈنے آئی سحر چراغ لیے
سوادِ شام سے جو لوٹ کر نہیں آیا

تمہارے شہر میں کیا ہو گیا ہے لوگوں کو
بہت دنوں سے کوئی دار پر نہیں آیا

تری تلاش میں ہم تو لہولہان ہوئے
کہ سنگ آئے بہت سنگِ در نہیں آیا

نہ دیکھے ہم نے مسافت کے روز و شب ایسے
کہ عمر ہونے کو آئی ہے گھر نہیں آیا

جلائے ہم نے سرِ خار آبلوں کے چراغ
سفر کا ہم کو قرینہ مگر نہیں آیا

اُسی کا نام مسلسل لبوں پہ ہے تشنہ
ہمیں وہ یاد کبھی اس قدر نہیں آیا

اُترا تھا مثلِ ماہ وہ اک روز آب میں
اس دن سے موج موج ہے صد اضطراب میں

خوشبو ورق پہ چھوڑ گئی رنگ کے نقوش
میں پھول رکھ کے بھول گیا تھا کتاب میں

بارش کی بوند بوند تھی پانی پہ شعلہ رنگ
چھالے پڑے ہوئے تھے کفِ دستِ آب میں

یہ زندگی تو نذرِ غمِ عشق ہو چکی
لکھوں غمِ جہاں کو میں کس کے حساب میں

وہ کیف ہے کہ نیند مری ٹوٹتی نہیں
گذرا ہے اس کے قرب کا اِک لمحہ خواب میں

داغِ فراق، کربِ شناسائی، شوقِ وصل
ڈالا ہے ایک عشق نے کتنے عذاب میں

خوشبو، گلاب، رنگ، دھنک، چاندنی، شراب
گزری ہے اپنی عمر اِسی آب و تاب میں

تھی میری تشنگی کو سمندر کی آرزو
لیکن مِلا ہے قطرۂ شبنم جواب میں

تشنہؔ مجھی سے حرفِ وفا معتبر ہے آج
روشن ہے میرا نام محبت کے باب میں

زندگی کو وہ بہ ہر رنگ بسر کرتا ہے
جو محبّت میں بھی جینے کو ہنر کرتا ہے

زندگی تیز قدم اور میں آہستہ خرام
دیکھئے کون کہاں ترکِ سفر کرتا ہے

میں تو بس رکھتا ہوں گزری ہوئی سانسوں کا حساب
زندگی میری کوئی اور بسر کرتا ہے

دشتِ تنہائی میں رہتا ہے مرے ساتھ یہ کون
کون خوابوں میں مرے ساتھ سفر کرتا ہے

کون دے جاتا ہے دروازۂ دل پر دستک
کون مجھ کو ترے آنے کی خبر کرتا ہے

بادباں کون گرا دیتا ہے طوفانوں میں
کون موجوں پہ حقارت سے نظر کرتا ہے

کون کرتا ہے تہ و بالا سکونِ دل و جاں
روز و شب کون مرے زیر و زبر کرتا ہے

کب اُسے آتا ہے تشنہ تری باتوں کا یقیں
برگِ گل کب بھلا پتھر پہ اثر کرتا ہے

نکل سکا نہ آج تک میں اُس کے اختیار سے
جو لائقِ وفا نہیں کسی بھی اعتبار سے

وہ بے جہت مسافرت کی راہ پر لگا گیا
سفر کی فال لی تھی میں نے اک ستارہ وار سے

اُسی طرف اُٹھے قدم ہوا جدھر بھی لے چلی
میں منزلوں کی سمت پوچھتا رہا غبار سے

سنانِ غم کی نوک سے کھنچا ہے خطِ آرزو
لہو کی نقش کاریاں ہیں زخمِ تازہ کار سے

یہ ساکنانِ دشتِ غم ترے مزاج داں نہیں
انہیں طلب ہے بارشوں کی ابرِ بے بہار سے

جہاں تھیں میری آشنائیاں تمام عمر کی
میں بن کے اجنبی گزر گیا اُسی دیار سے۔

نہ اُس کا عشق دائرہ نہ دامِ حلقہ بند ہے
مگر رِہا نہ ہو سکا کبھی میں اِس حصار سے

یہ تشنہ خرابِ غم، ہے کب سے تیری راہ میں
اُٹے ہیں اِس کے ماہ و سال گردِ انتظار سے

اِس راہِ محبت میں تُو ساتھ اگر ہوتا
ہر گام پہ گل کھِلتے، خوشبو کا سفر ہوتا

اُٹھتا مرے پہلو سے وہ مہرِ شناسائی
اِک روز تو ایسا بھی آغازِ سحر ہوتا

اک ہلکی سی دستک پر کھُلتا درِ دل مُجھ پر
اِس شہرِ شناسا میں ایسا کوئی گھر ہوتا

چُنتا ترے اشکوں کو وہ دامنِ مژگاں پہ
قسمت سے کبھی ایسا اے دیدۂ تر ہوتا

ہم ترکِ تعلّق کی پھر بات بھی سُن لیتے
تشنہ جو کوئی اُس کا محبُوبِ نظر ہوتا

•

اِسی سرگشتگی میں اپنی ساری عمر گزری ہے
کسی کو یاد رکھنے میں، کسی کو بھول جانے میں

جام میں نشۂ شب تاب اُتر آیا ہے
حلقۂ شوق میں مہتاب اُتر آیا ہے

رنگ جس خواب کے اُڑتے تھے خیالوں میں کبھی
کُنجِ تعبیر میں وہ خواب اُتر آیا ہے

تجھ کو باہوں میں سمیٹا تو یہ محسوس ہوا
موج میں حلقۂ گرداب اُتر آیا ہے

پھول کھل اُٹھے ہیں یوں دیدہ و دِل میں جیسے
نکہت و رنگ کا سیلاب اُتر آیا ہے

زینۂ شب سے دبے پاؤں سرِ خلوتِ جاں
وصل کا لمحۂ بیتاب اُتر آیا ہے

نیند کے نام سے دِل بیٹھ رہا ہے تشنہ
جاگتی آنکھوں میں وہ خواب اُتر آیا ہے

•

نہ طے ہو گا کٹھن رستوں کا یہ مشکل سفر تم سے
بڑا جی کا زیاں ہے درد کا رشتہ نبھانے میں

بکنے آئے تو ہر اک شخص خریدار لگا
شہر کا شہر ہمیں مصر کا بازار لگا

ہم تو یوسف تھے سو دامن کی گواہی لائے
ہم کو منصف بھی زلیخا کا طرفدار لگا

دشتِ غربت میں کھلا شدتِ احساس کا رنگ
اپنا سایہ بھی ہمیں سایۂ دیوار لگا

آئے تھے، کوچۂ جاناں کا تماشا کرنے
مفت میں جان کو یہ عشق کا آزار لگا

کیا اسیری کا کریں غم کہ ہمیں تو تشنہ
جو نہ تھا پابہ رسن وہ بھی گرفتار لگا

٭

ملے تھے دو ہی دن عیشِ محبت کو مقدر سے
گزارے وہ بھی دن اک دوسرے کو آزمانے میں

آج شعلوں کو یہ کِس نے دی ہوا
آگ برساتی ہوئی گذری ہوا

بے نشاں تھیں منزلیں مشکل سفر
قافلوں کی راہبر ٹھہری ہوا

تپ رہا ہے لالہ زاروں کا بدن
جا بسی کس دیس میں ٹھنڈی ہوا

آندھیوں کی زد میں ہے دل کا چراغ
کیا یہی ہے تیرے آنچل کی ہوا

اب کریں کیا جام چھلکانے کی بات
بن گئی اک خواب ساون کی ہوا

جانِ محفل ہم بھی تھے تشنہ کبھی
دوستوں میں تھی بڑی اپنی ہوا

٥

برسات کا بھیگا ہوا موسم ہے تری ذات
پھولوں کی طرح دل میں کھِلا ہے ترا پیکر

تو نے خود کو میری نظروں سے کبھی دیکھا بھی ہے
عکسِ حیرت آشنا تُو آئینہ سیما بھی ہے

آنکھ سے ٹپکے تو ہے اک قطرۂ خوں آب رنگ
یہ دلِ درد آشنا وسعت میں اِک صحرا بھی ہے

کارواں در کارواں جانِ سفر تھی جس کی ذات
وہ مسافر آج واماندہ بھی ہے تنہا بھی ہے

اے مرے مرہمِ نظر اب تک ہے تیرا منتظر
ایک زخمِ آشنائی جو ابھی تازہ بھی ہے

مجھ کو ترکِ عشق کا دینے چلے ہو مشورہ
اے مرے چارہ گرو تم نے اُسے دیکھا بھی ہے

اے چراغِ شام تیرے ساتھ جلنے کے لیے
اس سوادِ شامِ غم میں اک دلِ تنہا بھی ہے

عشق میں تشنہ عجب اک کشمکش ہے زندگی
خواب کی خواہش بھی ہے تعبیر کا دھڑکا بھی ہے

آج کے اوراق پر کل کی خبر لکھتا رہوں
جو بھی سوچوں شہر کی دیوار پر لکھتا رہوں

اپنے ماہ و سال کو لکھتا رہوں قلزم مثال
اپنے روز و شب کو لمحوں کا بھنور لکھتا رہوں

آبلوں کی روشنائی میں ڈبو کر نوکِ خار
دامنِ صحرا پہ رودادِ سفر لکھتا رہوں

ہر شناسا کو کہوں میں دوست از راہِ خلوص
ہر مسافر کو میں اپنا ہم سفر لکھتا رہوں

کربلا در کربلا ہوتا رہوں میں بھی شہید
اپنے خوں سے داستانِ خیر و شر لکھتا رہوں

حق ادا کر جاؤں لکھنے کا سرِ قرطاسِ جاں
ہاتھ کیا سر بھی قلم ہو جاتے پر لکھتا رہوں

آیۂ اشعار کا مجھ پہ بھی ہو تشنہ نزول
عمر بھر لکھتا رہوں اور خوب تر لکھتا رہوں

روشنیِ جاں لرزاں لرزاں رقص میں تھی
جیسے اک لو زیرِ داماں رقص میں تھی

کارِ کمال تھا عشق میں اپنا جینا بھی
انگاروں پر عمرِ گریزاں رقص میں تھی

کوئی بگولہ گذرا تو محسوس ہُوا
اپنی گردِ قافلۂ جاں رقص میں تھی

جشنِ وصالِ یار میں ہم ہی مست نہ تھے
اوّلِ شب سے شمعِ شبستاں رقص میں تھی

بہہ نکلے تھے دریا اپنے کناروں سے
بستی بستی موجۂ طوفاں رقص میں تھی

تیز ہوا میں روشنیاں تھیں سینہ سپر
دیے کی لَو بھی اُفتاں وخیزاں رقص میں تھی

گرمِ سفر جب مَیں تھا عشق کی راہوں میں
گردِ منزلِ کوچۂ جاناں رقص میں تھی

تشنہ اس کا نغمۂ سوزِ دروں سُن کر
ضربِ زخمۂ تارِ رگِ جاں رقص میں تھی

نغموں کی تان، ساز کی جھنکار گر گئی
دِل کیا بجھا کہ خون کی رفتار گر گئی

نِکلے ہیں لوگ اپنے گھروں سے کچھ اِس طرح
جیسے ہر اک مکان کی دیوار گر گئی

بازار میں ہمیں تھے جو بِکنے سے رہ گئے
قیمت لگی تو قدرِ خریدار گر گئی

مٹّی کے ڈھیر کو کوئی کب تک سنبھالتا
اچھا ہوا جو ریت کی دیوار گر گئی

کچھ جاں فروش آئے تھے مقتل میں سر بہ کف
ہر دستِ کج کلاہ سے تلوار گر گئی

مَیں دائروں میں بانٹ رہا تھا حیات کو
اک زاویے پہ ہاتھ سے پَرکار گر گئی

تشنہ کنارِ شام سسکتی ہے روشنی
شب کی لحد میں صبح کی دستار گر گئی

سودا ہمارے سر میں تجھے چاہنے کا تھا
عہدِ شروعِ عشق بھی کس معرکے کا تھا

سُن کر ہمارا حال یہ کیا حال کر لیا
تم رو پڑے، یہ وقت دُعا مانگنے کا تھا

محرومِ پیش رفت رہے، ہم سے خوش خرام
دشتِ زیاں میں اپنا سفر دائرے کا تھا

پیمائشِ سفر نے کیے حوصلے تمام
ہر سنگِ میل، سنگ مرے راستے کا تھا

خود پر ہنسے تھے ہم بھی زمانے کے ساتھ ساتھ
یہ مرحلہ بھی عشق میں کس حوصلے کا تھا

اے ساکنانِ شہر کوئی تازہ واردات
شیشہ گروں میں ذکر بہت آئینے کا تھا

اب تو سُبک رُوی سے گزر اے صبا خرام
خود ہٹ گیا جو سنگ ترے راستے کا تھا

آنکھیں مری تھیں اور ترا عکس رُو بُرو
یہ سحرِ دید تھا کہ فسوں آئینے کا تھا

نِکلی تھی مدتوں میں ملاقات کی سبیل
تشنہ کہو یہ کون سا موقع گِلے کا تھا

کبھی تو ختم یہ راہوں کے پیچ و خم ہوں گے
وہ دن بھی آئے گا جب منزلوں پہ ہم ہوں گے

ہمارے ساتھ چلیں گے ہواؤں کے لشکر
سفر میں ہم بھی بگولوں کے ہم قدم ہوں گے

کبھی تو ہم بھی چلیں گے اٹھا کے سر اپنا
علم سپاہِ ستم کے کبھی تو خم ہوں گے

وہ انجمن ہو کہ مقتل، وہ دار ہو کہ دیار
تمہارا ذکر رہے گا جہاں بھی ہم ہوں گے

بڑھے گی اور ابھی تیرگیٔ شامِ الم
چراغِ انجمنِ یار اور کم ہوں گے

چراغ جلنے نہ دے گی ہوائے تیرہ نسب
یہ لگ رہا ہے اندھیرے کبھی نہ کم ہوں گے

ابھی سے تم مرے تشنہ اُداس ہو اتنے
بہت سے چاند ابھی نذرِ شامِ غم ہوں گے

نیرنگِ روزگار عجب چال چل گیا
منزل قریب آئی تو رستہ بدل گیا

ہم خستہ گام خوابِ سفر دیکھتے رہے
اور قافلہ حدودِ نظر سے نکل گیا

کر تو لیا تھا جشنِ چراغاں کا اہتمام
اک شخص عین وقت پہ آنکھیں بدل گیا

آتش بہ جاں وجود تھا آشوبِ وقت میں
تھی اتنی تیز دھوپ کہ سایہ بھی جل گیا

اس رند کو سلام کہ اے صبحِ میکدہ
جو اپنی لغزشوں کے سہارے سنبھل گیا

تشنہ سحر کا یہ بھی تو اندھیر کم نہیں
تاروں کی ایک فوج کو سورج نگل گیا

راستہ جب کبھی ہموار مِلا ہے مجھ کو
مژدۂ منزلِ دشوار مِلا ہے مجھ کو

اب تو مشکل ہے مرے سر کا سلامت رہنا
ورثۂ طُرّہ و دستار مِلا ہے مجھ کو

مرضِ عشق کا ممکن نہیں اب کوئی علاج
اِک مسیحا سے یہ آزار مِلا ہے مجھ کو

جو سرِ بزم مِلا کرتا تھا غیروں کی طرح
کس محبّت سے سرِ دار مِلا ہے مجھ کو

اُس کی مرہم نظری پر یہ گماں گزرا ہے
آج جیسے مرا غم خوار مِلا ہے مجھ کو

شہر میں بارشِ گُل جس پہ تھی کل تک وہی آج
دست و پا بستہ سرِ دار مِلا ہے مجھ کو

کتنے آشوبِ مسافت سے میں گزرا تشنہ
پھر کہیں سایۂ دیوار مِلا ہے مجھ کو

اُسیرِ دشتِ بلا کا نہ ماجرا کہنا
تمام پُوچھنے والوں کو بس دُعا کہنا

یہ کہنا رات گذرتی ہے اب بھی آنکھوں میں
تمہاری یاد کا قائم ہے سلسلہ کہنا

یہ کہنا اب بھی سلگتا ہے جسم کا چندن
تمہارا قُرب تھا اِک شعلۂ حنا کہنا

یہ کہنا چاند اُترتا ہے بام پر اب بھی
مگر نہیں وہ شبِ ماہ کا مزا کہنا

یہ کہنا مسندِ شاخِ نمو پہ تھا جو کبھی
وہ پھول صورتِ خوشبو بکھر گیا کہنا

یہ کہنا قریۂ جاں میں ہیں دم بخود سب لوگ
تمام شہر ہوا مقتلِ نوا کہنا

یہ کہنا حسرتِ تعمیر اب بھی ہے دل میں
بنا لیا ہے مکاں تو مکاں نُما کہنا

یہ کہنا ہم نے ہی طوفاں میں ڈال دی کشتی
قصور اپنا ہے دریا کو کیا بُرا کہنا

یہ کہنا ہو گئے ہم اتنے مصلحت اندیش
چلے جو لُو تو اُسے بھی خنک ہوا کہنا

یہ کہنا ہار نہ مانی کبھی اندھیروں سے
بُجھے چراغ تو دِل کو جلا لیا کہنا

یہ کہنا تم سے بچھڑ کر بکھر گیا تشنہؔ
کہ جیسے ہاتھ سے گِر جائے آئینہ کہنا

○○

رات نے کنکر ڈالے میری آنکھوں میں
نیند کسے پھر آئی تیری یاد آئی

پھر برہا کے گیت فضاؤں میں گونجے
پھر تیری یاد آئی تیری یاد آئی

وہ تماشا جو سرِ عرصۂ محشر ہو گا
ایک پتھرائی ہوئی آنکھ کا منظر ہو گا

تو چلا جائے گا اِک موڑ پہ رخصت ہو کر
میری پلکوں پہ شناسائی کا گوہر ہو گا

کس کو معلوم تھا اک روز یہ دن آئے گا
میرا سایہ مرے قامت کے برابر ہو گا

کیا خبر تھی کہ اسیری ہے محبّت کا نصیب
زُلفِ شب رنگ کا ہر پیچ مقدر ہو گا

گریۂ شامِ الم لکھے گا آئینِ فراق
ہر نفس سینے میں اُترا ہوا خنجر ہو گا

دل کی دیوار پہ کندہ ہیں ترے نام کے حرف
اور کیا مجھ کو ترے نام سے بڑھ کر ہو گا

چند لمحوں میں بدل جاتا ہے لوگوں کا سُلوک
پھول جن میں ہیں انہیں ہاتھوں میں پتھّر ہو گا

ٹھہر جائے گی کہیں ساعتِ آہستہ خرام
مہرِ شب دیدہ سرِ شام نگوں سر ہو گا

ہوں گی افواجِ سحر میری کماں میں تشنہ
میرے قدموں میں شبِ تار کا لشکر ہو گا

تری طرح اگر ہم بھی گریز پا ہوتے
ہمیں یہ غم تو نہ ہوتا کبھی جُدا ہوتے

سبک مزاج تو ہم بھی تھے اے نگارِ بہار
چمن میں ہوتے تو خوش گامیٔ صبا ہوتے

تمہارے دم سے ملا ہے سراغِ منزلِ شوق
جو تم نہ ہوتے تو ہم دشت کی ہوا ہوتے

جراحتوں کو نہ ہوتا پھر اندمال کا غم
کفِ حنائی اگر زخم آشنا ہوتے

تمہیں بھی ہوتا مری مشکلوں کا اندازہ
کسی سفر میں جو تم بھی برہنہ پا ہوتے

وفا کے نام پہ لوٹا جنہوں نے نقدِ حیات
خدا نہ کردہ یہی بُت اگر خدا ہوتے

تمام عمر یہ ارماں رہا ہمیں تشنہ
کہ اس کے ہونٹوں پہ ہم حرفِ مدعا ہوتے

گریۂ بام ہی لایا نہ غمِ در لایا
گھر کے آنگن سے میں یادوں کے صنوبر لایا

ہم نے اس شہر میں دیکھا ہے یہی حُسنِ سلوک
پھول برسائے تھے جس نے وہی پتھر لایا

وہ جو تھا نشۂ شب تاب، سرِ میخانہ
چاندنی ساغرِ مہتاب میں بھر کر لایا

رات کا پچھلا پہر شہر میں تنہا ہو گا
یہ مجھے کون سرِ شام مرے گھر لایا

کر دیا سائے کو یہ کس نے کشیدہ قامت
کون پرچھائیں کو یہ میرے برابر لایا

ایک طوفاں نے ڈبویا مجھے میرے اندر
ایک سیلاب مجھے ذات کے باہر لایا

اور بڑھتی ہی گئی تشنگیٔ دشتِ وفا
گل بھی اس دشت میں کانٹوں کا مقدّر لایا

خوب تھا جشنِ ہنر شہرِ ہنر میں تشنہ
لے کے آیا کوئی دستار کوئی سر لایا

ہم نے ہر راستہ بے خوف و خطر کاٹ دیا
تنِ تنہا یہ محبّت کا سفر کاٹ دیا

کتنے بے مہر ہیں یہ شہر بسانے والے
جس کی چھاؤں میں پلے تھے وہ شجر کاٹ دیا

اب بھلا کون کرے تاج محل کی تخلیق!
سطوتِ شاہ نے ہر دستِ ہنر کاٹ دیا

ہم نے دیکھا ہے سیاست کا یہ حسنِ انصاف
جس پہ دستار سجی تھی وہی سر کاٹ دیا

ایک ہیں عرصۂ جرأت میں اسیر و آزاد
تشنہ کیا غم پرِ پرواز اگر کاٹ دیا

••

اِک فلک بنا لیتی اور حدِ بینائی
عرش سے اُدھر ہوتا گر یہی جہاں اپنا

شہریت ملے ہم کو بے حصار شہروں کی
عرش آشیاں اپنا گھر ہو لامکاں اپنا

میں عناں گیرِ راہوارِ ہوا
میرے قدموں میں ہے غبارِ ہوا

میں بگولہ ہوں اپنی وحشت میں
پھر رہا ہوں سرِ دیارِ ہوا

اُن چراغوں کو بھی جلائے رکھو
جن کے دم سے ہے کاروبارِ ہوا

آندھیوں کو کہیں قیام نہیں
عارضی ہے یہ اقتدارِ ہوا

خاک آلود ہو گئے چہرے
ہو گئے لوگ نذرِ کارِ ہوا

آندھیاں کاٹنی پڑیں آخر
کس قدر خوش تھے کاشتکارِ ہوا

رُخ ٹھہرتا نہیں کبھی ان کا
جن پہ چلتا ہے اختیارِ ہوا

کھول کر بادباں بھی دیکھ لیے
اب کرے کون اعتبارِ ہوا

کیوں زمیں بوس ہو گئے وہ شجر
جن کو رہتا تھا انتظارِ ہوا

رہروِ جادۂ وفا تنہا
دُور تک دشتِ بے کنارِ ہوا

رات تشنہ بھی نوحہ گر کس کی
دربدر کُو بہ کوِ نگارِ ہوا

••

گزاری عمرِ گزشتہ جسے بِلنے مِلانے میں
بہت ہے عافیت دل کی اب اُس کو بھول جانے میں

مری شوریدگی اِک دن اُسے بھی ڈھونڈ ہی لے گی
تمہاری مثل کوئی اور بھی ہو گا زمانے میں

یہ کون خاک نشیں درمیان بیٹھ گیا
زمین اُٹھ نہ سکی آسمان بیٹھ گیا

گذر گیا ترا غم دل کو منہدم کر کے
اٹھی وہ موج شکستہ مکان بیٹھ گیا

نہ رت جگے سکوں آسا نہ نیند چین افزا
خیال و خواب میں یہ کس کا دھیان بیٹھ گیا

عجب ہے کیا جو ہمیں راستہ نہیں ملتا
ہماری راہ میں سارا جہان بیٹھ گیا

ہُوا سفینۂ جاں کو سنبھالنا مشکل
ہوائے درد اٹھی بادبان بیٹھ گیا

کبھی جو اُس نے مِرا حال ہنس کے پوچھ لیا
سنانے اُس کو وہی داستان بیٹھ گیا

کہیں نہ ہو تُو کسی اور کا خطِ تقدیر
یقیں کے دل میں یہ کیسا گمان بیٹھ گیا

جہاں لُٹا کے گیا تھا متاعِ جاں تشنہ
اُسی مقام پہ پھر تیرا دھیان بیٹھ گیا

نہ دوستی نہ محبّت نہ آشنائی گئی
گئی جو ساتھ تو اپنی شکستہ پائی گئی

وہ جس کا نام قیامت رکھا ہے دُنیا نے
اُٹھے گی تیری گلی سے اگر اٹھائی گئی

بنا کے عالمِ ہستی کو آئینہ خانہ
مری شبیہہ مجھے بارہا دکھائی گئی

کیا ازل سے مجھے گنبدِ حیات میں بند
وہ بازگشت ہوئی تابِ لب کُشائی گئی

اُٹھے ہیں لوگ باَندازِ خود شناسائی
امیرِ شہر بس اب تیری پیشوائی گئی

حریمِ عدل میں تشنہ ہوا تھا حشر بپا
لکھی لکھائی سزا جب مجھے سُنائی گئی

••

انفاس کی خوشبو سے مُعطّر ہیں دِل و جاں
زلفوں کی طرح مجھ پہ کُھلا ہے ترا پیکر

تشنہ نے تجھے مانگا تھا رو رو کے خدا سے
محرومِ تمنّا کی دعا ہے ترا پیکر

بوقتِ شام سرِ بام وہ ہویدا ہُوا
بروئے مجمعِ یاراں بڑا تماشا ہوا

کل انجمن میں چلیں حسن و عشق کی باتیں
ہمارے ساتھ تمہارا ابھی خوب چرچا ہوا

میں ڈر رہا ہوں کہیں پھر نہ ہو وہی تعبیر
کہ آج دیکھا ہے اک خواب میں نے دیکھا ہوا

اُڑی خیالوں میں پھر زلفِ یار کی خُوشبو
ہوائے یاد سے پھر دل کا زخم تازہ ہُوا

غنودہ کر دیا احساسِ لمس نے مجھ کو
گذر گیا کوئی دھیرے سے مجھ کو چھُوتا ہُوا

اُسی سے تھی تجھے کیا کیا نہ خلوت آرائی
ابھی گیا ہے جو تیری گلی سے روتا ہُوا

گزاری عمرِ محبّت کچھ اِس طرح تشنہ
کفِ ہَوا میں ہو جیسے چراغ رکھّا ہُوا

کس کس سے دوستی ہوئی کچھ دھیان میں نہیں
ان میں سے ایک بھی مرے سامان میں نہیں

رسمِ وفا کا اُن سے نبھانا بھی ہے محال
ترکِ تعلقات بھی امکان میں نہیں

باندھیں کسی سے عہدِ وفا ہم تو کس طرح
اک تار بھی تو اپنے گریبان میں نہیں

کیوں ہم نے ہار مان لی کیوں ڈال دی سپر
یہ سانحہ شکست کے اعلان میں نہیں

یہ جاں سپردگی ہے اُسی ایک بات پر
جو بات میرے عشق کے پیمان میں نہیں

وہ نام جو نوشتۂ رسوائی ہو گیا
اس نام کا کوئی مری پہچان میں نہیں

شوریدگی کو ہیں سبھی آسائشیں نصیب
وہ شہر میں ہے کیا جو بیابان میں نہیں

تشنہ وہ شب لکھی ہے ہمارے نصیب میں
جس کی سحر کا ذکر بھی امکان میں نہیں

متاعِ جاں سرِ بازار لٹوانے کو جی چاہا
اُسی بے مہر کے کوچے میں بِھر جانے کو جی چاہا

شکستِ دل کی خاموشی گراں کچھ اس قدر گذری
دکانِ شیشہ گر پہ سنگ برسانے کو جی چاہا

کہیں کا بھی نہ رکھا شدّتِ احساس نے مجھ کو
مرا ہر پھول کے ہمراہ مُرجھانے کو جی چاہا

یہ اندوہِ فروغِ آگہی بھی اک قیامت ہے
ہزاروں بار اس جینے سے مرجانے کو جی چاہا

ہجومِ یاس نے جب اشک بھی چھوڑے نہ آنکھوں میں
لبِ گل پر ہنسی بن کر بکھر جانے کو جی چاہا

فضائیں چپ، ہراساں شہر، گلیاں دم بخود تشنہ
مرا سنگِ صدا ایسے میں برسانے کو جی چاہا

•

توڑ دیجے ضربتِ آواز سے مُہرِ سکوت
ہر لبِ خاموش پر حرفِ بیاں ہو جائیے

ہر تماشے میں ترا حُسنِ تماشا دیکھوں
چاند دیکھوں کہ ترا چاند سا چہرہ دیکھوں

شاق گذرے ترا ہنگامۂ محفل تجھ پر
میں بھری بزم میں اک دن تجھے تنہا دیکھوں

بے مثالی بھی تری اب تو گراں ہے دل پر
دیکھ کر تجھ کو یہ خواہش ہے کہ تجھ سا دیکھوں

ہاں کوئی موجِ نفس ، کوئی ہوا کا جھونکا
کیوں سرِ قریۂ جاں دِل کو سُلگتا دیکھوں

دیکھ کر اُس کو یہ محسوس ہوا ہے تشنہ
خواب میں جیسے میں خُوشبو کا سراپا دیکھوں

کیوں نہ ہو آساں مسافت اس پہ خاک و آب کی
ہمرہی جس کو میسّر ہو دلِ بیتاب کی

تجھ کو پا لینے کی خواہش میں ہوں مصروفِ سفر
کر رہا ہوں اک تلاشِ بے محل نایاب کی

اپنے گھر کی آرزو میں ہوں فسوں بندِ حصار
پڑھ کے آجاتا ہوں تختی ہر مکاں کے باب کی

ہم بھی آنکھیں مَل کے اٹھیں ختم تو ہونے کو آئے
نیند کی ویران راہوں میں مسافت خواب کی

زندگی ہے اک سفر جلتے ہوئے صحراؤں میں
اس مسافر کا کہ جس کو فکر ہو اسباب کی

ہم بھی راہوں میں ٹھہرتے بیٹھتے چھاؤں میں ہم
کیا کریں دل کو کہ رکھتا ہے صفت سیماب کی

ابر میں ہم ساغری کا اور ہوتا ہے مزا
سرخوشی کچھ اور ہوتی ہے شبِ مہتاب کی

ہم تھے اور اس کے لب و ابرو کا روز و شب طواف
تشنہ کب یہ منزلت تھی منبر و محراب کی

جہانِ ہست میں گم ہو گیا ہوں لا کی طرح
مرے وجود کا عالم ہے ماورا کی طرح

کیا گیا ہے مجھے لوحِ کائنات پہ نقش
میں لفظ لفظ میں ہوں حرفِ بے نوا کی طرح

ملے مجھے بھی تو آخر سماعتوں کی لحد
میں دوشِ وقت پہ ہوں لاشۂ صدا کی طرح

مری فضاؤں میں قدموں کی چاپ ہی گونجے
سکوتِ ذات ہے پھیلا ہوا خلا کی طرح

کسی کی آہ سے پگھلا نہ اشک ہی سے بہا
میں عرشِ ذات پہ بیٹھا رہا خُدا کی طرح

نہ دورِ جام مرے نام ہے نہ عارض و لب
میں بزمِ زیست میں ہوں دستِ نارسا کی طرح

مُجھی سے تم کو ملے گا سراغِ منزلِ شوق
ہوا ہوں ثبت میں راہوں پہ نقشِ پا کی طرح

مرے لیے بھی درِ مستجاب کُھل جاتے
قبول و رَد میں ہوں اندیشۂ دُعا کی طرح

تمام جبر ہے تشنہؔ یہ قیدِ رسمِ وجود
گذر رہے ہیں شب و روز اِک سزا کی طرح

محبّت کو سرِ بازار رُسوا ہم نے دیکھا تھا
پھر اس کے بعد اک اپنا تماشا ہم نے دیکھا تھا

بپا ہم نے کیا تھا جشنِ حسرت اس کی محفل میں
بہر سو رقصِ طاؤسِ تمنّا ہم نے دیکھا تھا

کہے دیتی تھیں دل کا حال اس کی منتظر آنکھیں
بھری محفل میں بھی اس کو اکیلا ہم نے دیکھا تھا

تمہیں نے چشم پوشی کی جہاں کی پیش بینی سے
جو ہونا تھا وہ دیواروں پہ لکّھا ہم نے دیکھا تھا

ہوا ہے روشنیٔ دشمن، مگر اے حوصلہ مندی
چراغِ رہگذر کو سر کشیدہ ہم نے دیکھا تھا

ہے یہ دستِ گریباں آشنا کتنا جنوں پرور
ہر اک تارِ گریباں وحشت آرا ہم نے دیکھا تھا

تھا آدابِ نظر کی حد سے بڑھ کر ذوقِ نظارہ
سرِ محفل بھی تشنہ یہ تماشا ہم نے دیکھا تھا

کب عشق کی باتوں کے بنانے سے کھُلا ہے
وہ مجھ سے کسی اور بہانے سے کھُلا ہے

مدّت سے مقدّر کی طرح بند پڑا تھا
رستہ مرے گھر کا ترے آنے سے کھُلا ہے

ہمسائے کے آنگن کی طرح ہے مرا آنگن
یہ بیچ کی دیوار گرانے سے کھُلا ہے

سب برف کے پیکر ہیں پگھلنے کے لیے ہیں
یہ مجھ پہ بھری دھوپ میں آنے سے کھُلا ہے

پانی میں بھی اک آگ لگانے کی صفت ہے
بارش میں ترے ساتھ نہانے سے کھُلا ہے

اظہارِ محبّت کا ستم دیکھ لو تشنہ
وہ بند ہے تم پر جو زمانے سے کھُلا ہے

•

کوئی خبر کرے تشنہ یہ شہر والوں کو
بسائے جائیں جو دل سے وہ گھر اجڑتے نہیں

میرے سحر و شام کو ویران کر گیا
وہ اور مجھ کو بے سر و سامان کر گیا

کیا شخص تھا کہ پہلی ملاقات ہی کے بعد
مجھ کو حریفِ جیب و گریبان کر گیا

شعروں میں اُس سے حالِ شبِ غم کہا تھا وہ
میرے سپرد میرؔ کا دِیوان کر گیا

ملتا ہی کب تھا ایسا کہ وہ سب کے درمیاں
مجھ سے کبھی نہ ملنے کا اعلان کر گیا

اس سے ہر انجمن میں تھیں کیا کیا نہ رونقیں
ایسا گیا کہ شہر کو سُنسان کر گیا

تشنہ وہ دے کے دل کو سُلگنے کی آرزو
جلنا چراغِ شام کا آسان کر گیا

کچھ ایسے کھوئے کہ پھر عمر بھر نہ پائے گئے
دیارِ ذات میں ہم دربدر پھرائے گئے

عجب طرح کا چراغاں کیا گیا اب کے
دیئے جلائے گئے اور دِل بجھائے گئے

بہار سے کوئی رشتہ نہ باغ سے نسبت
کچھ ایسے گل سرِ شاخِ نمو کھلائے گئے

نہ ٹوٹنا تھا نہ ٹوٹا فسونِ قریۂ شب
ہمیں سحر کے بڑے تذکرے سُنائے گئے

ہَوا کا کیا ہے ہَوا تو ہے روشنی بیزار
چراغ پھر بھی سرِ رہگذر جلائے گئے

جہاں لُٹا کے گئے تھے متاعِ دل اِک روز
جنابِ تشنہ اُسی انجمن میں پائے گئے

عروجِ ماہ کا عالم ہے اور میں تنہا
فروغِ سلسلۂ غم ہے اور میں تنہا

یہ نو بہار کا عالم یہ مُشک بُو موسم
ہوا کے لہجے میں سرگم ہے اور میں تنہا

ترے بدن کی ہے خُوشبو صبا کی سانسوں میں
سرُور و کیف کا عالم ہے اور میں تنہا

کُھلے ہوئے ہیں فضا میں خیال کے گیسو
چراغِ شام بھی مدّھم ہے اور مَیں تنہا

برس رہی ہے گلابی دھنک کے ہونٹوں سے
گلُوں پہ بادۂ شبنم ہے اور میں تنہا

نشے سے ٹوٹ رہے ہیں فراق کے لمحے
وصالِ یار کا موسم ہے اور میں تنہا

کہاں گیا مرے تشنہ، وہ تیرا یارِ عزیز
کہ دل کا درد بھی گم گم ہے اور میں تنہا ۔

اپنی زیبائی پہ تھی خود روشنی حیرت زدہ
دیدنی طاقِ حرم میں تھا چراغِ میکدہ

اک قدم آگے کی جانب اِک قدم پیچھے کی سَمت
زندگی ہے یا خرامِ آہوئے وحشت زَدہ

شورِ ناقوسِ برہمن ہے نہ کنہیاؤں کا رقص
سازشِ اصنام سے ویراں ہے صحنِ بُتکدہ

میکشی سے بھی گئے تُم سے جُدا ہونے کے بعد
یاد بھی اب تو نہیں ہم کو فضائے میکدہ

بزمِ عیش آگیں میں سب رونق تھی دورِ جام تک
حلقۂ پیمانہ میں رقصاں تھی روحِ میکدہ

ہر طرف اِک نقشۂ تاراجیٔ طوفان ہے
دل ہے تشنہ عشق میں اک قریۂ آفت زدہ

تیرا آسانی سے ملنا میرا حاصل ہی نہ ہو
اور کیا ہو گی سوا مشکل کہ مشکل ہی نہ ہو

اس طرب آسا تماشا گاہ میں سب سے الگ
آبدیدہ جو کھڑا ہے میرا قاتل ہی نہ ہو

کیجیے اس کارواں کی خوش تمامی کی دعا
بے جہت جس کا سفر ہو جس کی منزل ہی نہ ہو

حلقۂ گرداب میں کب تک سمندر کا سفر
وہ سفینہ ڈوب جائے جس کا ساحل ہی نہ ہو

آج تجھ سے بن ملے دل پر یہ گذرا ہے گماں
آج کا دن زندگی میں جیسے شامل ہی نہ ہو

چل رہی ہے دیر سے جو کارواں کے ساتھ ساتھ
دیکھنا تشنہ کہیں یہ گردِ منزل ہی نہ ہو

لہو اُجالوں کا ہے تیرگی کے خنجر پر
اندھیرے ٹوٹ پڑے روشنی کے لشکر پر

مرے وجود کا ہر لمحہ ہے شکن آلود
تڑپ رہا ہوں میں تنہائیوں کے بستر پر

ہوائے یاد کے رُخ پر ہیں بادبان کھُلے
رواں ہے کشتیٔ دل درد کے سمندر پر

کوئی تو دے گا مجھے بھی جزائے بے ہنری
کوئی تو رکھے گا دستار بھی مرے سر پر

نگار خانۂ ارضِ ہنر کا حال ہے یہ
بتوں نے سنگ اٹھائے ہوئے ہیں آذر پر

سوادِ آئینہ گر میں مِلا تھا وہ تنہا
جو اپنے نقش سجا کر گیا تھا پتھر پر

نہ جانے کون سی رُت زندگی بدل ڈالے
لرزنے لگتا ہے دل ہر بدلتے منظر پر

میں گہری نیند سے چونکا تو یہ ہوا محسوس
کہ جیسے لمس کی شبنم گرے لبِ تر پر

میں اپنی کاہکشاں سے بچھڑ گیا تشنہ
وہ چاند ہوں کہ جو ٹھہرا نہ اپنے محور پر

موجِ ہوائے وصلِ یار رات نہال کر گئی
اس کے ہی خواب دیکھتے ہجر کی شب گزر گئی

لمحہ وہ ایک وصل کا حاصلِ عمرِ عشق تھا
گیسوئے یار کیا کھلے خوشبوئے جاں بکھر گئی

ہم ہی شروعِ عشق کے ٹھہرے تھے موردِ خطا
تہمتِ ترکِ عشق بھی آج ہمارے سر گئی

کرتے رہے مشاہدہ ایک سے ایک حُسن کا
پیشِ نظر وہی رہا آنکھ جدھر جدھر گئی

تول رہا تھا بال و پر طائرِ شاخِ آرزو
دیکھ کے رُخ ہواؤں کے جرأتِ بال و پر گئی

تشنہ، خستہ گام کو تیری تلاش ہی رہی
حسرتِ جستجو اُسے لے کر کدھر کدھر گئی

کہ جیسے جادہ و منزل سے آشنا تھے سبھی
بس ایک ہم ہی مسافر تھے رہنما تھے سبھی

اماں ملی نہ کہیں تیرے غم کے ماروں کو
چراغِ دل کے لیے دشت کی ہوا تھے سبھی

کسی کے پاس علاجِ غمِ فراق نہ تھا
بزعمِ چارہ گری درد آشنا تھے سبھی

بچا سکا نہ کوئی ڈوبنے سے کشتی کو
وگرنہ کہنے کو کشتی کے ناخدا تھے سبھی

بڑھاتے دستِ طلب کس کے سامنے تشنہ
ہمارے واسطے اس شہر میں خدا تھے سبھی

٥

عشق کے آزار میں ہو جائیے تشنہ خراب
اس قدر کیجے محبّت، رائیگاں ہو جائیے

جو اشک جیبِ چشم میں تھے سب بہا چکے
اے ہجرِ یار ہم زرِ گریہ لٹا چکے

ایفائے عہد کے لیے اب آئے ہو کہ جب
کب کا چراغِ بامِ تمنّا بجھا چکے

اے بزم اُس ہجومِ جنوں آشنا کو رو
تھیں جن سے رونقیں وہ سبھی لوگ جا چکے

سوداگری کریں بھی تو کیا ہم زیاں نصیب
یہ نقدِ جاں بھی اس کی گلی میں گنوا چکے

اب کیا ہوا سے جنگ کریں ہم سے بے سپر
کشتی کے بادبان بھی ہم تو گرا چکے

تشنہ کسی طرح بھی نہ آیا وہ راہ پر
ترکش میں جتنے تیر تھے ہم سب چلا چکے

جنہیں بھول جانے کی کوشش بہت کی وہی لوگ ہم کو مگر یاد آئے
ترے کجکلاہوں کو دیکھا تو سارے سزاوارِ دستار سر یاد آئے

وہی سوندھی سوندھی سی مٹی کی خوشبو وہی بھینی بھینی مہک موتیے کی
ترے گھر کے آنگن میں بیٹھے تو ہم کو بہت اپنے دیوار و در یاد آئے

بڑے حوصلہ مند تھے وہ مسافر جو تاریک راہوں میں انجم قدم تھے
سرِ منزلِ جاں بھٹکنے لگے ہم تو اپنے وہی ہم سفر یاد آئے

جنہیں ناز تھا اپنی گُل پیکری پر دھنک پیرہن لوگ کیا ہو گئے وہ
وہ جن سے تھا رشتہ ہمیں دلبری کا دُکھا دل تو وہ ٹوٹ کر یاد آئے

کڑی دھوپ میں جن کے سائے کی ٹھنڈک تھی اک روز آغوشِ مادر کی صورت
چڑھا سر پہ جب دشتِ غربت کا سورج گھنی چھاؤں کے وہ شجر یاد آئے

وہ صحنوں میں چرپائیوں کی قطاریں وہ شفاف بستر وہ پُروا کے جھونکے
حصارِ در و بام میں رہ کے تشنہ وہ انگنائیوں والے گھر یاد آئے

ہم اہلِ عشق پہ ایسا زوال بھی آیا
کہ تجھ سے ترکِ وفا کا خیال بھی آیا

وہ سُن کے حال مرا زیرِ لب ہنسا پہلے
پھر اُس کے چہرے پہ رنگِ ملال بھی آیا

کہا تھا ایک نجومی نے جس کو وصل کا سال
فراقِ یار سلامت وہ سال بھی آیا

یہ جاں نثار ترے محوِ ذکر دار رہے
میں سارے حوصلے دل کے نکال بھی آیا

تھے وہ مراحلِ منزل کہ بارہا تشنہ
سفر میں ترکِ سفر کا سوال بھی آیا

••

یہ لگتا ہے کہ جیسے اک قیامت دل سے گزرے گی
خبر کچھ ہم کو ہے یہ رات کس مشکل سے گزرے گی

ہماری جستجو نے تو ہمیں گم راہ کر ڈالا
ہوا کے ساتھ ہولیں یہ کسی منزل سے گزرے گی

اک صنم معبد کی زینت اک ابھی پتھر میں ہے
ایک ہے منظر میں روکش ایک پس منظر میں ہے

دلبرانِ شہر کیا تم سے ہوئی کوئی خطا
آج وہ آوارۂ شب شام سے ہی گھر میں ہے

احتسابِ روز و شب ، خوفِ مکافاتِ عمل
ابتدا سے ہی یہ دُنیا عرصۂ محشر میں ہے

اے سفیرانِ چمن کیا آ گئے اُڑنے کے دن
اک چمک سی آج کل کیوں میرے بال و پر میں ہے

میرے مٹ جانے میں ہے پیدائی ہستی کا رنگ
نغمۂ صد عشق و مستی میری خاکستر میں ہے

لمحہ لمحہ جانتا ہے عیب پوشی کا ہنر
کیا بلا کی پردہ داری رات کی چادر میں ہے

رنگ خوشبو تازگی زیبائی کو ملتا نکھار
گُل کی ساری تازگی اس کامنی پیکر میں ہے

زندگی کو اور کیا ہم سے مشقت چاہیے
کیا یہ کم ہے عشق کا سودا ہمارے سر میں ہے

حاصلِ عیشِ جوانی بن گئے پنگھٹ کے خواب
شوخیٔ رفتار کا سارا نشہ گاگر میں ہے

ملتا ہے ہر قطرۂ باراں کو کب بطنِ صدف
جوہرِ آب نمو، پیدائی گوہر میں ہے

حسن کی رعنائی ہے مرہونِ یک نوکِ ہنر
ساری زیبائی بتوں کی ناخنِ آذر میں ہے

زُلف نے کھُل کر لٹائی خوشبوئے مشک و عبیر
کوئی گُل پیکر شکن اندر شکن بستر میں ہے

جنسِ وفا کا سرد ہے بازار دیکھنا
جانے نہ پائے کوئی خریدار دیکھنا

اس دوپہر میں دھوپ کا آشوب دیکھ کر
بے قامتیِ سایۂ اشجار دیکھنا

خبروں کا ہے جو شوق تو اخبار دیکھ کر
شہ سرخیِ نوشتۂ دیوار دیکھنا

رقصِ ہوائے موسمِ گُل دیکھنے کے بعد
موجِ خرامِ یارِ طرحدار دیکھنا

بڑھنے دو تیرگیٔ شبِ مقتلِ ستم
نکلے گا ایک چاند سرِدار دیکھنا

بالا قدوں کی سمت سنبھل کر نظر کہ ہے
گرنے کو سر سے آپ کے دستار دیکھنا

خنجر کشانِ عہدِ ستم کے لیے نوید
دل ہے حریفِ لذّتِ آزار دیکھنا

ہوتا رہا اگر یونہی بربادیوں کا ذکر
مٹّی میں اپنے شہر کے آثار دیکھنا

سرمستیٔ حیات سرِ بزم دیکھ کر
اک وحشتی کا رقص سرِدار دیکھنا

مَیں سُن رہا ہوں دیر سے قدموں کی آہٹیں
دشمن نہ ہو کوئی پسِ دیوار دیکھنا

بازار کی دکاں میں سجا کر متاعِ جاں
کم ظرفیٔ نگاہِ خریدار دیکھنا

تشنہؔ تمہارا واسطہ لالہ رخوں سے ہے
دیکھو پڑے گا جان کا آزار دیکھنا

ہر احتیاطِ ضبط کو ناکام کر گئی
وہ چشمِ نیم باز بڑا کام کر گئی

کب سے عذابِ نزع میں تھا مبتلا چراغ
اس مرحلے پہ موجِ ہوا کام کر گئی

کھینچا تھا جب علاج سے چارہ گروں نے ہاتھ
اس وقت ماں کی ایک دعا کام کر گئی

دل لے چلا تھا کوئے ملامت کو پھر مجھے
پیروں میں پڑ کے میری انا کام کر گئی

جیسے کسی نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی
کچھ اِس ادا سے تیری صدا کام کر گئی

••

فرق نفرت اور محبت میں نہ رکھیے درمیاں
اس قدر کیجے یقیں کہ بدگماں ہو جائیے

سائے کی دشمن ہُوا کرتی ہے صحراؤں کی دھوپ
اپنے سائے کے لیے خود سائباں ہو جائیے

مے خواروں کو مے خانے کی یاد دلاتے رہنا
تشنہ لبی کا سالانہ تہوار مناتے رہنا

کچھ تو انہیں بھی مل جائے آسودگیٔ شوریدہ سری
اہلِ جنوں کے رستے میں دیوار اٹھاتے رہنا

روشنیوں کا علم اٹھانا شب آثار فضاؤں میں
تیز ہواؤں کے رُخ پر اک دیا جلاتے رہنا

اپنے آپ سے باتیں کرنا ساحل اور سمندر کی
گیلی ریت پہ نقش بنانا اور مٹاتے رہنا

تم سے مل کر جینے کے امکان دکھائی دیتے ہیں
دیکھنا ہم سے ملتے رہنا، آتے جاتے رہنا

ہر اک گام پہ لٹ جانے کا خوف سا دل میں رہتا ہے
کٹھن سفر ہے جاگتے رہنا اور جگاتے رہنا

قول و قرار پہ رکھنا ہم کو کر کے روز نیا وعدہ
تعبیروں کی بات نہ کرنا خواب دکھاتے رہنا

اچھی غزلیں کہتے رہنا اپنا جگر لہو کر کے
بزمِ سخن میں تشنہ اپنا رنگ جماتے رہنا

شریکِ شب تو ہو گئی، شریکِ غم نہ ہو سکی
حوالۂ وفا سے بھی وہ محترم نہ ہو سکی

مری یہ شدّتِ وفا، "سلوکِ عشق آشنا"
ترے شعارِ بے وفائی سے بھی کم نہ ہو سکی

میں ساحلوں کی طرح اُس کو دیکھتا ہی رہ گیا
بچھڑ گئی جو موج پھر کبھی بہم نہ ہو سکی

ہماری سمت دیکھ کر گئی رقیب کی طرف
اٹھی تھی مشکلوں سے جو نظرِ کرم نہ ہو سکی

خمار و میکشی میں ربط ہی نہ تھا تو کیا عجب
ہماری تشنگی پاسِ بیش و کم نہ ہو سکی

ہر ایک اشک موجِ یم، سرشکِ اعتبارِ غم
وہ بے گہر صدف رہی جو آنکھ نم نہ ہو سکی

بہت جگر کو خوں کیا، سرشتۂ جنوں کیا
مگر حدیثِ شامِ غم، کبھی رقم نہ ہو سکی

یہ تشنۂ خجستہ گام، کس کی جستجو میں ہے
اُسی کے واسطے کہ جو شریکِ غم نہ ہو سکی

گھر کی جنگ گلی میں لڑنا اچھی بات نہیں
دیکھو دیواروں پر لکھنا اچھی بات نہیں

یہ تو پت جھڑ کے موسم کی ایک علامت ہے
پیڑوں سے پتّوں کا گرنا اچھی بات نہیں

کوئی تو رستہ طے ہو جائے کوئی تو منزل ٹھہرے
سدا ہوا کے رُخ پر چلنا اچھی بات نہیں

عشق میں آنسو پی لینا بھی ایک روایت ہے
حالِ غمِ دل سب سے کہنا اچھی بات نہیں

جنگ میں ہوگا لاکھ یہ جائز لیکن عشق میں تو
آگے بڑھ کر پیچھے ہٹنا اچھی بات نہیں

عشق میں تشنہ، تم پر سو الزام بھی آئیں گے
دیکھو رسوائی سے ڈرنا اچھی بات نہیں

وہ دِن ڈھلتے ہی تشنہ مجھ کو اکثر یاد آتا ہے
پھر اُس کے بعد اِک طوفانِ ابر و باد آتا ہے

سرِ مژگاں چراغوں کی قطاریں جھلملاتی ہیں
ستارے ٹوٹنے لگتے ہیں جب وہ یاد آتا ہے

اِسی رستے میں پہلے دشت آتا ہے خرابی کا
پھر اُس کے بعد میرا خانۂ برباد آتا ہے

کہیں بنیاد رکھتا ہے نئی بستی کی جب کوئی
بہت مجھ کو خیالِ قریۂ اجداد آتا ہے

سزاوارِ محبت ہوں، مجھے معلوم ہے تشنہ
کہ یہ الزام جب آتا ہے بے بُنیاد آتا ہے

٥

تمہیں کہیں کا نہ رکھے گی آسروں کی تلاش
جو اپنے آپ سنورتے ہیں وہ بگڑتے نہیں

دل میں تجھے رکھوں کہ نگاہوں میں سمو لوں
اے حسن تجھے شوق کی میزان میں تولوں

جی چاہتا ہے موتیوں والے ترے آنسو
میں سوزنِ مژگاں سے رگِ جاں میں پرولوں

اتنا تو قریب آ کہ ہو قربت کا بھی احساس
پلکوں کی انی آبلۂ جاں میں چبھو لوں

مجھ پہ بھی کھُلیں تیرے خدوخال کے اسرار
اے زیست ترے بندِ قبا میں بھی تو کھولوُں

بیٹھے رہو زلفوں کو بکھیرے ہوئے مجھ پہ
اِک عُمر کا جاگا ہوں ذرا چین سے سولوُں

کٹ جائے گی یہ راہ تری ہم سفری میں
اے گردِ رہِ یار ترے ساتھ ہی ہو لوُں

تشنہ مری قسمت کی طرح وہ بھی ہے کج رو
مَیں اپنے مقدر کی طرح اِس کو بھی رو لوُں

وہ کہ ہر عہدِ محبّت سے مُکرتا جائے
دل وہ ظالم کہ اُسی شخص پہ مرتا جائے

میرے پہلو میں وہ آیا بھی تو خوشبو کی طرح
میں اُسے جتنا سمیٹوں وہ بکھرتا جائے

کُھلتے جائیں جو ترے بندِ قبا زُلف کے ساتھ
رنگِ پیراہنِ شب اور نکھرتا جائے

مشتہر ہو کے بڑھے اور نکو نامیٔ عشق
دل بھی شائستہ غم ہو کے سنورتا جائے

عشق کی نرم نگاہی سے حِنا ہوں رُخسار
حُسن وہ حُسن جو دیکھے سے نِکھرتا جائے

کیوں نہ ہم اس کو دل وجان سے چاہیں تشنہؔ
وہ جو اک دُشمنِ جاں پیار بھی کرتا جائے

غمِ زندگی سے گذر گئے غمِ بیش و کم سے گذر گئے
وہ جو آشنا ترے غم سے تھے وہ ہر ایک غم سے گذر گئے

تھے عجیب راہ کے پیچ و خم بڑی الجھنیں تھیں بہر قدم
تری زُلف کے جو اسیر تھے سبھی پیچ و خم سے گذر گئے

وہی شہرِ جاں کی ہماہمی، وہی کوئے دل کی رواروی
یہاں لاکھ تم سے نہیں رہے یہاں لاکھ ہم سے گذر گئے

یہ نشیبِ جاں یہ فرازِ غم ہمیں کر گئے بڑے محترم
ہمیں دل بِلا تھا جہاں نما ہمیں جامِ جَم سے گذر گئے

گو بڑے کٹھن تھے وہ راستے بڑی پُر خطر تھیں وہ منزلیں
ترا ساتھ جن کو نصیب تھا وہی دشتِ غم سے گذر گئے

•

دوستوں نے اپنایا مسلکِ حریفانہ
اب نہ غم گسار اپنا اور نہ رازداں اپنا

ارادہ نیک مرے راہبر کا لگتا نہیں
مجھے تو یہ بھی ستارہ سفر کا لگتا نہیں

کشادہ صحن تھا اور لوگ بھی زیادہ تھے
جو نقشہ سامنے ہے میرے گھر کا لگتا نہیں

پڑاؤ ڈالا تھا بستی بسائے لیتے ہو
قیام سے تو ارادہ سفر کا لگتا نہیں

حدودِ ظرف میں رہ کر جو مانگی جاتی ہیں
انہی دُعاؤں کو دھڑکا اثر کا لگتا نہیں

میں بے یقینی میں اتنا یقین رکھتا ہوں
کہ اب سراب بھی دھوکا نظر کا لگتا نہیں

ہر ایک گام پہ یہ کون روکتا ہے قدم
یہ راستہ تو مجھے تیرے گھر کا لگتا نہیں

جو رزقِ خاک ہوا ہے بہار کی لَو میں
انہیں وہ برگ ابھی اِس شجر کا لگتا نہیں

سبھی ہیں تشنہ یہاں دل ستانِ خانۂ غیر
ہمیں تو کوئی یہاں اپنے گھر کا لگتا نہیں

پاسِ حیا تھا، راہ میں بندِ قبا نہ تھا
کارِ جنوں سے عشق کا عقدہ کھلا نہ تھا

ساحل کی ریت کا تھا سفر اس کی ہمرہی
دیکھا جو لوٹ کر تو کہیں نقشِ پا نہ تھا

باقی دمِ چراغ میں تھی زندگی ابھی
لرزاں تھی لَو مگر ابھی شعلہ بجھا نہ تھا

مصروف تھیں ابھی سرِ کاکُل سے اُنگلیاں
پوروں کے لمس سے وہ ابھی آشنا نہ تھا

مقصود ہم کو تیرا تماشا تھا بام پر
یہ چاک دامنی تو فقط اِک بہانہ تھا

کس طرح قدرِ حُسن کو طے کرتے بوالہوس
بازار میں ابھی کوئی یوسف بِکا نہ تھا

دامانِ شب پہ تھے مہ و انجم ہزار داغ
اک زخمِ روشنی تھا کہ اب تک بھرا نہ تھا

تشنہؔ بنا لیا تھا سبھی کو شریکِ غم
تم ہی بہت بھلے تھے زمانہ بُرا نہ تھا

کوئی مشکل ہو تجھے یاد برابر رکھا
میری جاں تجھ کو سدا جان سے بڑھ کر رکھا

گرمیِ بزمِ طرب پر بھی رہی اپنی نظر
آنکھ میں بجھتے چراغوں کا بھی منظر رکھا

ذکر سُن کر بھی ترا آنکھ سے آنسو نہ بہے
شدتِ درد میں بھی ہاتھ نہ دل پر رکھا

کب تری زلفوں سے چاہی ہے رہائی ہم نے
بازوئے جرأتِ پرواز میں کب پَر رکھا

شہر میں جی نہ لگا اپنا تو صحرا ہو آئے
ہم نے اس خانہ خرابی میں بھی اک گھر رکھا

خوابِ آسودگیٔ جاں کی ملیں تعبیریں
جب بھی تھک کر ترے شانوں پہ کبھی سر رکھا

تشنہ لوگوں کا بھی کیا طرزِ پذیرائی ہے
ایک میں پھول تو اک ہاتھ میں پتھر رکھا

سب منظر سارے پس منظر بھول گیا
سنگِ ملامت یاد رہے سر بھول گیا

دل پر اک ایسا بوجھ سا ہے جیسے کوئی
شاخِ گُل پر پتھّر رکھ کر بھول گیا

اِس دنیا کو دیکھ کے لگتا ہے جیسے
حشر اُٹھا کر داورِ محشر بھول گیا

تیری گلی سے اتنے تھے مانوس قدم
اپنے گھر کا رستہ اکثر بھول گیا

سنگِ میل جسے سمجھا دورانِ سفر
ختمِ سفر پر مَیں وہ پتّھر بھول گیا

تشنہ لبی کو قطرۂ نیساں کافی تھا
اتنی سی اِک بات سمندر بھول گیا

وسعتِ دامنِ امکاں بھی لگی تنگ ہمیں
اُڑنا آیا تو عجب رنگ پروں میں آئے

ہم اس امکاں پہ لُٹا بیٹھے ہیں اسبابِ سفر
شاید احساسِ زیاں ہم سفروں میں آئے

کوئی ساغر، کوئی دل، کوئی تو پیماں ٹوٹے
کچھ تو شوریدگی آشفتہ سروں میں آئے

اُن در و بام کی حسرت کوئی دیکھے کہ جہاں
بیریاں پک گئیں پتھر نہ گھروں میں آئے

بے زباں بند اگر شورِ سلاسل ہی سہی
تابِ شنوائی تو بیدادگروں میں آئے

جو بھی فرہاد لقب قیس نسب تھے تشنہؔ
نام میرا بھی انہیں ناموروں میں آئے

جاتے جاتے کس کے حق میں لکھ گیا کیا دیکھنا
آج کی دیوار پر کل کا نوشتہ دیکھنا

آندھیاں بھی ہو گئیں شائستۂ آدابِ رقص
آج سے پابندِ وحشت ہر بگولہ دیکھنا

کیا ہوئے وہ چاند سے چہرے وہ انجم زاد لوگ
عمر بھر اب اُن پری زادوں کا رستہ دیکھنا

دیکھنے والو یہ بزم آرائی شب دیکھ کر
پھر چراغِ آخرِ شب کا تماشا دیکھنا

قریۂ جاناں میں جب آئیں گے ہم انجم قدم
مطلعِ مہتاب ہو گا ہر دریچہ دیکھنا

شہر کے ہر چوک پر ہے سُولیوں کا اہتمام
تم بھی اب ان کجکلاہوں کا تماشا دیکھنا

بچتا میں اِس لڑائی میں کس کس کے وار سے
حملہ ہوا تھا مجھ پہ یمین و یسار سے

تازہ لہو کے چھینٹوں سے مقتل ہے لالہ رنگ
اُترا ہے سربلند کوئی اوجِ دار سے

آنکھوں میں شب گزارنا تا صبح جاگنا
مرتا ہوں روز کشمکشِ انتظار سے

دستِ خزاں لباسِ بہاراں نہ چاک کر
سایہ جُدا نہ کر شجرِ سایہ دار سے

پاسِ وفا، شعورِ جنوں، احتیاطِ غم
میں معتبر ہوں عشق میں ہر اعتبار سے

موجِ ہوائے عشق ذرا دم ٹھہرنے دے
آیا ہوں لَوٹ کر میں ابھی کوئے یار سے

دامن ہے تار تار گریباں لہو لہو
تشنہؔ اب اور چاہیئے بھی کیا بہار سے

مرے سفینۂ جاں کو کھُلا سمندر دے
تلاطموں کا دوشالا ہَوا کی چادر دے

اگر سلگتا رہا ہُوں مَیں آفتاب مثال
تو میرے طرّۂ دستار کو گلِ تر دے

صدف نے دیکھ لی گہرے سمندروں کی بساط
ہر ایک قطرۂ نیساں کو ظرفِ گوہر دے

نہیں یہ عشق کی محرومیاں مزاج مرا
مری رگوں میں محبت کی روشنی بھر دے

اگر تجھے ہے شکستِ غنیمِ شب مقصود
مری کمان میں بھی روشنی کا لشکر دے

مجھے بھی سیر کرا آج بزمِ امکاں کی
مری نظر کو بھی ہفت آسماں کا منظر دے

قفس کو توڑ کے اُڑ جائے طائرِ افکار
مکاں کی قید اُٹھا مجھ کو لامکاں کر دے

مرے شعور کو دے شہپرِ خیال کی باگ
جنونِ شوق کو یا رب نویدِ محشر دے

اگر نہ دُور ہو یہ تیرگیٔ شب تشنہؔ
تو پھر ہَوا مرے دل کا چراغ گُل کر دے

حافظ دگرچہ می طلبی از نعیم دہر
مے می چشی و طرۂ دلدار می کشی

نام	سید عالمتاب علی
تخلص	تشنہ
تاریخ پیدائش	۱۰ ؍ اپریل ۱۹۳۵ء
مقام پیدائش	میرٹھ یوپی
تعلیم	ایم ۔ کام
	ایف سی آئی ٹی لندن
	او اینڈ ایم کنیکٹیکٹ یونیورسٹی امریکہ
	ابلاغ ۔ مشی گن یونیورسٹی امریکہ
پیشہ	آغاز ۔ سرکاری ملازمت
	حال ۔ چیئرمین و مینجنگ ڈائریکٹر
	عالم گروپ آف کمپنیز
تصنیفات	◐ موج موج تشنگی ـــــ شاعری کا مجموعہ
	◐ حادثات کی روک تھام ـــــ انگریزی کتابچہ
	◐ کراچی ٹرانسپورٹ کا حال اور مستقبل ـــــ انگریزی کتابچہ
زیرِ طبع	◐ خوابِ نیم شب ـــــ شکسپیئر کے مڈسمر نائٹ ڈریم کا ترجمہ
	◐ کفِ ہوا ـــــ نظمیں اور دوہوں کا مجموعہ

پاکستانی شعر کی زبان اور اس کا قماش و اسلوب آپ اپنی شکل و صورت اس طرح قائم کر چکی ہے کہ ہندوستانی شعر کی عام زبان سے الگ تھلگ صاف پہچانی جاتی ہے جو فیض احمد فیض سے شروع تو ہوتی ہے مگر اس کی واضح نمائندگی شعرا کی وہ نسل کر رہی ہے جو اب ۴۰ سال یا اس سے کچھ زائد کے دائرے میں ہے۔ اسی گروہ میں ایک روشن نام عالمتاب تشنہ کا ہے۔

جس طرح شاعر اپنی زبان سے اور اس کی زبان اپنی لفظیات سے معتبر ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے تشنہ کے مقام شعر کا تعین سننے اور پڑھنے والا بڑی آسانی سے کر سکتا ہے۔ یہ خوش گو اور ذہین شاعر بعض جدیدیت زدہ حلقے کے علی الرغم اس حقیقت سے بھی واقف ہے کہ اسلاف نے جو ورثہ چھوڑا ہے وہ قابلِ احترام ہوتے ہوتے ایسا نہیں ہے جس میں نئے گوشے نہ پیدا کیے جا سکتے ہوں۔ لہٰذا تشنہ کا پڑھنے والا یہ دیکھے گا کہ یہ اسلاف کی راہ پر بھی چلتے ہیں تو اپنی انفرادیت کو بچائے ہوتے اس سلامت روی سے گزر جاتے ہیں کہ داد دیتے ہی بنتی ہے۔ ہماری آج کی شاعری میں اُس عنصر خاص کی عام طور پر کمی پائی جاتی ہے جسے رندی و سرمستی کہتے ہیں۔ اِسے ہم شاعری اور بالخصوص غزل اور تغزل کی روح کہیں تو شاید بے جا نہ ہو یہی وہ عنصر ہے جو سامع و قاری کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کے وجدان سے براہِ راست ربط پیدا کرتا اور مفہوم شعر کے اثر انداز ہونے کی راہیں نکالتا ہے۔ رندی و سرمستی کے لیے شاعر کا مرفعہ الحال ہونا ضروری نہیں ہے۔ حافظ، میر و غالب کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ دراصل رندی و سرمستی کسی مضمون کو اپنے وجدان کے سانچے میں ڈھال کر مرنجاں مرنج لہجے میں اس طرح پیش کرنے کا نام ہے کہ قاری و سامع کے لیے اندوہ حیات سے آویزش اور برتاؤ روزمرہ کا ایک ایسا گوارا عمل بن جائے، جسے زندگی گزارنے کا سلیقہ کہتے ہیں۔ ہماری موجودہ نئی شاعری میں اس عنصر کی نمایاں کمی ہے۔ بلکہ مجھے تو اس سے زیادہ یہ خطرہ بھی نظر آیا ہے کہ آج کے بعض اچھے نئے کہنے والوں پر نئے الفاظ و استعارات کا دباؤ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ناسخ لکھنوی کا وہ اسلوب جسے بجا طور پر عرصہ ہُوا رد کیا جا چکا ہے، پھر سے راہ پانے لگا ہے مگر عالمتاب تشنہ کی غزل اس عیب سے پاک اور اُس جوہر سے مالا مال ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔ اُن کا نکھرا ہوا اسلوب صاف ستھری لفظیات، برملا اور برجستہ تشبیہات اور استعارات ان کو اپنے ہم عصر شعرا میں ایک ممتاز مقام عطا کرتے ہیں تشنہ کو عصری آگہی کا بھی توانا احساس ہے اور روایت سے وابستگی کو بھی وہ اپنی شاعری کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر شعر ندرتِ خیال، قدرتِ بیاں اور فکر و تخیل کی بلندی کا مظہر ہے۔

عالمتاب تشنہ بلاشبہ ایسے شاعر ہیں جن کا نام جریدۂ وقت پر اس طرح کندہ ہو جاتا ہے جسے مٹا دینا مُرورِ ایام کے لیے آسان نہیں ہوا کرتا۔

مجروح سلطانپوری

۱۵ جون ۱۹۸۵ء